موہن داس کرم چند گاندھی

باب نمبر ا

بچپن

میرے پتا کبا گاندھی کو دولت اکٹھی کرنے کا لالچ نہیں تھا۔ اس لیے وہ ہمارے
اور ہمارے بھائیوں کے لیے بہت کم اثاثہ چھوڑ گئے تھے۔
پتا جی نے صرف تجربہ سے ہی تعلیم پائی تھی۔ سکول کی تعلیم صرف اتنی ہی پائی ہوگی
جس کو آج ہم اپر پرائمری کہتے ہیں۔ تواریخ اور جغرافیہ سے انہیں بالکل واقفیت نہیں تھی۔ مگر
عام طور وہ اتنے اونچے درجے کے جانکار تھے کہ نہایت عمیق تر امور کے سلجھانے میں یا
ہزاروں آدمیوں سے کام لینے میں انہیں دقت پیش نہیں آتی تھی۔ دھارمک تعلیم نہ ہونے
کے برابر تھی لیکن مندروں میں جانے سے اور کتھا پران سننے پر جس دھرم سے بے شمار
ہندوؤں کو آسانی سے جانکاری ہو جاتی ہے وہ انہیں ملی ہوئی تھی۔ اپنی عمر کے آخری ایام میں
ایک ودوان برہمن کے مشورے سے جو ہمارے خاندان کے ہمدرد تھے انہوں نے گیتا کا
پاٹھ شروع کیا تھا اور روزانہ پوجا کے وقت چند شلوک اونچی آواز سے ورد کیا کرتے تھے۔
وہ خاندان کے محب، سچائی کے متلاشی، بہادر، فراخ دل اور غضب ناک تھے۔
رشوت سے ہمیشہ دور بھاگتے تھے۔ اسی لیے انصاف میں شہرت رکھتے تھے۔ ان کی شہرت
ہمارے خاندان اور اس سے باہر بھی تھی۔ وہ حکومت کے بڑے وفادار تھے۔ ایک بار
اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ نے راج کوٹ کے ٹھاکر صاحب کی شان کے خلاف چند الفاظ
استعمال کیے تو انہوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ صاحب بگڑ گئے اور کبا گاندھی کو
معافی مانگنے کا حکم دیا۔ معافی مانگنے سے انکار کر دینے پر چند گھنٹے حوالات میں بھی رہے لیکن

وہ متزلزل نہ ہوئے۔ اس لیے آخرکار صاحب نے انہیں رہا کرنے کا حکم دے دیا۔

میرے آلۂ خیال پر ایسے اثرات ہیں کہ ماتا جی سادھوتی استری تھیں۔ وہ بڑی خیال پرور تھیں۔ پوجا پاٹھ کے بغیر کبھی بھوجن نہ کرتیں' مندر روزانہ جاتیں۔ میں نے جب ہوش سنبھالا ہے۔ یاد نہیں پڑتا کہ انہوں نے چاتر ماس کا ورت کبھی چھوڑا ہو۔ کٹھن سے کٹھن برت وہ لے کر پورا کیا کرتی تھیں۔ بیماری کی حالت میں بھی وہ ورت نہیں چھوڑتی تھیں۔ چتر ماس میں ایک وقت کے بھوجن کا ورت تو ان کے لیے معمولی بات تھی۔ اتنے سے تسلی نہ پا کر ایک بار چتر ماس میں انہوں نے ہر تیسرے دن فاقہ کرنے کی ٹھانی۔ لگاتار دو تین فاقے ان کے لیے معمولی بات تھی۔ ایک چتر ماس میں انہوں نے سوریہ نارائن کے درشن کرنے کے بعد ہی بھوجن کرنے کا اصول بنایا۔ اس چوماسے میں ہم بچے بڑی بے صبری سے بادلوں کی طرف دیکھا کرتے تھے کہ کب سوریہ نارائن کے نکلنے کی خبر ماں کو دیں اور کب وہ بھوجن کریں۔ چوماسے میں کئی بار سوریہ بھگوان کے درشن مشکل ہو جاتے ہیں۔ مجھے ایسے دن یاد ہیں جب ہم سوریہ کو دیکھتے اور چلاتے۔ ماں ماں سوریہ نکلا۔ اور ماں جلد جلد آتی تب تک سوریہ چھپ جاتا۔ وہ یہ کہتی ہوئی لوٹ جاتیں۔ کچھ نہیں آج بھوجن کرنا لکھا نہیں جان پڑتا اور جا کر اپنے کاموں میں لگ جاتیں۔

وہ عام طور پر کافی جانکار تھیں۔ دربار کی سب باتیں جانتی تھیں۔ دنو اس میں وہ عقلمند خیال کی جاتی تھیں۔ بچپن کے ایام میں ماں مجھے دربار گڑھ میں ساتھ لے جایا کرتی تھیں اور ماں جی صاحب (ٹھاکر جی کی بیوہ ماتا) سے ان کی جو باتیں ہوا کرتی تھیں۔ اس میں سے کچھ مجھے اب تک یاد ہیں۔

ان ماتا پتا کے ہاں آشون بدی ۱۲ سمت ۱۹۲۵ء یعنی ۲/اکتوبر ۱۸۶۹ء کو پور بندر یعنی سداماں پوری میں میرا جنم ہوا۔

بچپن پور بندر میں ہی گزرا۔ ایسا یاد آتا ہے کہ کسی پاٹھ شالہ میں پڑھنے بٹھایا گیا تھا۔ مشکل سے کچھ پہاڑے سیکھے ہوں گے۔ باقی تو اور لڑکوں کے ساتھ گورو جی کو گالی دینا سیکھنے کے علاوہ اور کچھ سیکھا یاد نہیں ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگاتا ہوں کہ میری عقل کند رہی ہوگی اور قوت یادداشت کچی۔

☆☆☆

باب نمبر ۲

اسکول میں

پورو بندر سے پتا جی راجستھانی کورٹ کے رکن بن کر راج کوٹ گئے تب میری عمر کوئی سات سال کی ہوگی۔ راج کوٹ کے دیہاتی مدرسہ میں داخل ہو گیا۔ ان ایام کی مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ماسٹروں کے نام وغیرہ بھی یاد ہیں۔ پورو بندر کی طرح وہاں کی پڑھائی کے متعلق کوئی خاص بات جاننے کے قابل نہیں۔ میرا اشمار عام طلبا میں ہوگا۔ مدرسہ سے اپر مڈل اور وہاں سے ہائی تک پہنچنے میں بارہ برس بیت گئے کہ اس وقت تک میں نے کبھی استاد کو دھوکا دیا ہو اس کا علم نہیں۔ نہ ابھی تک دوست بنانے کی یاد ہے۔ میں بڑا جھینپو لڑکا تھا۔ مدرسہ میں اپنے کام سے کام رکھتا۔ گھنٹی بجتے بجتے پہنچ جاتا اور سکول بند ہوتے ہی گھر بھاگ آتا۔ "بھاگ آتا" لفظ میں نے جان بوجھ کر استعمال کیا ہے کیونکہ میری کسی سے باتیں کرنے کی رغبت نہیں تھی۔ مجھے یہ ڈر بھی بنا رہتا تھا کہ کوئی میرا مخول نہ اڑائے۔

ہائی اسکول کے پہلے ہی سال کے امتحان کے وقت کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ محکمہ تعلیم کے انسپکٹر جائیلس صاحب معائنہ کے لیے آئے۔ انہوں نے پہلے درجہ کے طلبا کو پانچ لفظ لکھوائے۔ ان میں ایک لفظ تھا۔ کیٹل (Kettle) اس کا ہجہ میں نے غلط لکھا۔ ماسٹر نے مجھے بوٹ کی ٹھوکر مار کر سمجھایا لیکن میں کہاں سمجھنے والا تھا؟ میرے دماغ میں یہ بات نہ آئی کہ ماسٹر صاحب مجھے سامنے والے لڑکے کی سلیٹ دیکھ کر درست کرنے کے لیے اشارہ کر رہے ہیں۔ میں نے یہ مان رکھا تھا کہ ماسٹر تو اس کام کے لیے تعینات ہیں کہ کوئی لڑکا دوسرے کی نقل نہ اڑا سکے۔ سب لڑکوں کے پانچوں لفظ صحیح نکلے۔ اکیلا میں ہی بیوقوف بن

گیا۔ میری بے وقوفی بعد کو ماسٹر نے بتائی مگر میرے جی پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ مجھے دوسرے لڑکوں کی نقل کرنا بھی نہ آیا۔

ایسا ہونے کے باوجود بھی ماسٹر کی نسبت میرا عزت کا خیال کم نہ ہوا۔ بڑے بزرگوں کے نقائص نہ دیکھنے کی صفت میری فطری تھی۔ بعد کو تو ان ماسٹر صاحب کے دوسرے عیب میری نظر میں آئے مگر اس کے باوجود میرا عزت کا خیال کم نہ ہوا۔ میں اتنا جانتا تھا کہ بڑے بزرگوں کے حکم کی تعمیل کرنی چاہیے۔ جو وہ کہیں کرنا چاہیے لیکن جو کچھ وہ کریں ان کا جج ہمیں نہیں بننا چاہیے۔

اسی اثناء میں دوسرے واقعے ہوئے جو مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ معمولی طور پر مجھے کورس کی کتابوں کے علاوہ کچھ بھی پڑھنے کا شوق نہیں تھا۔ سبق پورا کرنا چاہیے مگر ڈانٹ برداشت نہیں کی جاتی تھی۔ ماسٹر سے فریب کرنا نہیں آتا تھا۔ اس خیال سے میں سبق پڑھتا مگر دل نہیں لگتا تھا۔ اس لیے سبق کئی بار کچا رہ جاتا۔ اس حالت میں دوسری کتابیں پڑھنے کے لیے کیسے جی چاہتا؟ اچانک پتا جی کی خریدی ہوئی ایک کتاب ''شرون پترک بھگتی'' ناٹک پر میری نگاہ پڑی۔ پڑھنے کے لیے دل چاہنے لگا۔ بڑی رغبت اور توجہ سے میں نے اسے پڑھا۔ ان ایام میں لکڑی کے بکسوں سے تصویریں دکھانے والے بھی پھرا کرتے تھے۔ ان میں میں نے شرون کی اپنے ماں باپ کو کنوار میں بٹھا کر یاترا کے لیے لے جانے والی تصویر دیکھی تھی۔ دونوں چیزوں سے میں بہت متاثر ہوا۔ اور جی چاہنے لگا کہ شرون کی مانند ہو جاؤں۔ شرون کی موت پر اس کے ماں باپ کی آہ وزاری اب بھی یاد ہے۔ اس چھند کو میں نے بجانا سیکھ لیا تھا۔ مجھے گانے بجانے کا شوق تھا اور پتا جی نے ایک باجا بھی لا دیا تھا۔

اسی زمانہ میں کوئی ناٹک کمپنی آئی اور مجھے اس کا ناٹک دیکھنے کی اجازت مل گئی۔ اس میں ہریش چندر کا کھیل تھا۔ ایک بار ناٹک کو دیکھنے سے میری تسلی نہ ہوئی۔ بار بار اس کے دیکھنے کے لیے جی چاہتا تھا۔ مگر بار بار جانے کون دیتا تھا؟ جو کچھ بھی ہو میں نے اپنے جی میں ناٹک کو سینکڑوں بار دہرایا ہوگا۔ مجھے ہریش چندر کے خواب آیا کرتے تھے۔ اور یہی دھن لگی رہتی تھی کہ ہریش چندر کی طرح سب ستیہ وادی کیوں نہ بن جائیں؟ اور یہی خیال آتا کہ ہریش چندر کی مانند مصائب برداشت کرنا اور سچائی پر قائم رہنا ہی، سچی حقانیت ہے۔

میں نے تو یہی مان رکھا تھا کہ ناٹک میں ہریش چندر پر جیسی مصیبتیں پڑی ہیں۔ درحقیقت ویسی ہی پڑی ہوں گی۔ ہریش چندر کے دکھوں کو دیکھ کر اور انہیں یاد کرکے میں خوب رویا۔ آج میری عقل کہتی ہے کہ ممکن ہے ہریش چندر کوئی تاریخی ہستی نہ ہو لیکن میرے آلہ خیال میں تو ہریش چندر اور سرون ابھی تک زندہ ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ آج بھی اگر میں ناٹکوں کو پڑھوں تو آنکھوں میں آنسو اتر آئیں۔

☆☆☆

باب نمبر ۳

ہائی اسکول

جب میرا بیاہ ہوا تھا اس وقت میں ہائی اسکول میں پڑھتا تھا۔ میرے ساتھ میرے اور دو بھائی بھی اسی اسکول میں پڑھتے تھے۔ بڑے بھائی کافی اوپر کے درجہ میں تھے اور جن بھائی کا بیاہ میرے ساتھ ہی ہوا تھا۔ وہ مجھ سے ایک درجہ آگے تھے۔ بیاہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم دونوں بھائیوں کا ایک سال بیکار ہوگیا۔ میرے بھائی کو تو اور برا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ بیاہ کے بعد انہیں سکول چھوڑنا ہی پڑا۔ بھگوان جانتے ہیں کتنے نوجوانوں کو ایسے برے نتائج کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

میری پڑھائی جاری رہی۔ ہائی اسکول میں مجھے کند ذہن طالب علم خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ استادوں سے تو میں نے ہمیشہ پریم پایا تھا۔ ہر سال ماں باپ کو بچے کی پڑھائی اور چال چلن کے متعلق سرٹیفکیٹ روانہ کئے جاتے تھے۔ ان میں کسی دن میری پڑھائی اور چال چلن کی شکایت نہیں کی گئی۔ دوسرے درجہ کے بعد انعام بھی پائے اور پانچویں اور چھٹے درجہ میں متواتر چار روپے اور دس روپے ماہوار وظیفہ بھی ملتا رہا۔ اس کامیابی سے میری قابلیت کی نسبت قسمت کا زیادہ زور تھا۔ یہ وظائف تمام لڑکوں کے لیے نہیں سوراشٹر صوبہ کے طلبا کے ہی لیے تھے اور اس وقت چالیس پچاس طلبا کے درجہ میں سوراشٹر کے طالب علم ہو ہی کتنے سکتے تھے۔

میری یادداشت کے مطابق اپنی ہوشیاری پر مجھے ناز نہیں تھا۔ انعام اور وظائف ملا کرتے تو مجھے حیرت ہوا کرتی تھی لیکن ہاں مجھے اپنے اخلاق کا بڑا خیال رہتا تھا۔ اگر

اخلاق میں کوئی غلطی ہو جاتی تو مجھے رونا آ جاتا تھا۔ میرے لیے برداشت سے باہر تھا کہ میرے ذریعہ کوئی ایسی بات ہوتی۔ جس سے اساتذہ کو شکایت کا موقع ہاتھ آئے یا وہ دل میں ایسا خیال کریں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار مجھے مار کھانی پڑی تھی۔ مار کھانے کا اتنا دکھ نہیں تھا بلکہ یہ پچھتاوا تھا کہ میں سزا کا مستحق خیال کیا گیا ہوں۔ میں خوب رویا۔ یہ واقعہ پہلے یا دوسرے درجہ کا ہے۔ دوسرا واقعہ ساتویں جماعت کے وقت کا ہے۔ اس وقت "دوراب جی ایدل جی گیمی" ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہ باقاعدہ کام کرتے' کام لیتے اور اچھی تعلیم دیا کرتے تھے۔ انہوں نے اونچے درجے کے طلبا کے لیے کسرت اور کرکٹ لازمی کر دیا تھا مگر میرا جی اس میں نہیں لگتا تھا۔ ملازم ہونے سے پہلے تو میں کرکٹ' کسرت یا فٹ میں بالکل جایا ہی نہیں کرتا تھا۔ نہ جانے میں میری طبعی عادت بھی ایک وجہ تھی اب میں یہ دیکھتا ہوں کہ ورزش سے عدم رغبت میری غلطی تھی۔ اس وقت میرے خیالات ایسے غلط تھے کہ سمجھتا تھا ورزش کا تعلیم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بعد کو سمجھ آئی کہ حصول تعلیم میں ورزش اور جسمانی تعلیم کا ذہنی تعلیم کے مطابق ہی درجہ ہونا چاہیے۔

مگر پھر بھی میں کہنا چاہتا ہوں کہ ورزش میں شامل نہ ہونے سے کوئی نقصان نہ ہو کیونکہ میں نے کتابوں میں کھلی ہوا میں چہل قدمی کی تعریف پڑھی تھی۔ یہ مجھے پسند آئی اور اس وقت سے مجھے سیر کی عادت پڑ گئی جو اب تک جاری ہے۔ سیر بھی کسرت ہوتی ہے جس سے میرے بدن میں قدرے چستی آ گئی۔

ورزش کی بجائے سیر جاری رکھنے کی وجہ سے جسمانی ورزش نہ کرنے کی غلطی کے لیے تو مجھے سزا نہیں بھوگنی پڑی لیکن دوسری ایک غلطی کی سزا میں آج تک پا رہا ہوں۔ پتہ نہیں کہاں سے یہ غلط خیال مجھے مل گیا تھا کہ پڑھائی میں املا کے خوش خط ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ خیال ولایت جانے تک ذہن پر غالب رہا۔ بعد کو میں پچھتایا اور شرمایا۔ میں نے سمجھا کہ الفاظ کا خراب ہونا ادھوری تعلیم کی نشانی ہے ہر ایک نوجوان لڑکے اور لڑکی کو میری مثال سے سبق حاصل کرنا چاہیے اور سمجھ لینا چاہیے کہ املا کی خوشنمائی تعلیم کا لازمی جزو ہے۔

اس وقت میری طالب علمانہ زندگی کی دو باتیں قابلِ ذکر ہیں۔ چوتھے درجہ سے چند ایک طلبا کو انگریزی میں تعلیم دی جاتی تھی مگر میں کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ ریاضی میں

بالکل پیچھے تھا اور پھر انگریزی کی تعلیم ملنے کی وجہ سے سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا۔ میں کئی بار مایوس ہو جاتا کوشش کرتے کرتے جب الجبرا کی تیرھویں شکل تک پہنچا تو مجھے یکا یک یہ معلوم ہوا کہ یہ تو سب سے آسان علم ہے۔ جس بات میں صرف عقل کا سیدھا اور سادہ استعمال ہی پایا جاتا ہے۔ اس میں مشکل ہی کیا ہے؟ اس کے بعد ہی الجبرا میرے لیے آسان اور مزیدار موضوع بن گیا۔

سنسکرت مجھے اس سے بھی مشکل جان پڑی وہ کوئی از بر کرنے کی بات نہیں تھی۔ مگر سنسکرت میں میرے خیال میں زیادہ رٹنے کا ہی کام تھا۔ یہ موضوع بھی چوتھے درجہ میں شروع ہوتا تھا۔ چھٹے درجہ میں جا کر تو میرا دل بیٹھ گیا۔ سنسکرت کے استاد بڑے سخت تھے۔ طالب علموں کو کافی پڑھانے کا انہیں شوق تھا۔ سنسکرت اور فارسی کے درجہ میں ایک قسم کا مقابلہ تھا۔ فارسی کے مولوی صاحب نرم تھے۔

طالب علم آپس میں باتیں کرتے تھے کہ فارسی تو بہت آسان ہے اور فارسی کے معلم بھی بڑے نیک ہیں۔ طالب علم جتنا کام کرتے ہیں اتنے سے ہی وہ خوش ہو جاتے ہیں۔ آسان ہونے کی بات سے مجھے بھی لالچ آ گیا اور ایک دن فارسی کی کلاس میں جا کر بیٹھا۔ سنسکرت ماسٹر کو اس سے دکھ ہوا اور انہوں نے مجھے بلا کر کہا۔ ”تم ذرا سوچو کہ کس کے لڑکے ہو؟ اپنی دھارمک زبان نہیں سیکھو گے؟ مجھے اپنی تکلیف بیان کرو۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تمام طالب علم اچھی طرح سنسکرت سیکھ جائیں۔ آگے چل کر اس میں مزا ہی مزا ہے۔ تمہیں اس طرح مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ تم پھر میری کلاس میں آ جاؤ۔“

مجھے شرم آ گئی۔ ماسٹر کے سامنے انکار نہ کر سکا۔ آج میری آتما کرشن شنکر پانڈے کی مشکور ہے کیونکہ جتنی سنسکرت میں نے اس وقت پڑھی تھی۔ اگر اتنی بھی نہ پڑھی ہوتی تو آج میں سنسکرت سے لذت یاب ہی نہ ہوا اور نہ وہ کر سکتا چونکہ زیادہ سنسکرت نہ پڑھ سکا اس لیے مجھے اس کا پچھتاوا ہے کیونکہ آگے جا کر میں نے سمجھا کہ کسی بھی ہندو لڑکے کو سنسکرت کی پڑھائی سے محروم نہیں رہنا چاہیے۔

اب تو میں یہ مانتا ہوں کہ ہندوستان کے اعلیٰ طریقہ تعلیم میں اپنی زبان کے علاوہ قومی زبان ہندی، سنسکرت، فارسی، عربی اور انگریزی کو جگہ ملنی چاہیے۔ اتنی زبانوں کی گنتی

دیسی رہے دبائی، جو نے بینا شریر بھائی
پیلو پانچ ہاتھ پورو۔ پورو پانچ سینے

ان اشعار کا میرے آلہ خیال پر کامل اثر ہوا۔ میں ماننے لگا کہ گوشت خوری اچھی چیز ہے۔ اس سے مجھے حوصلہ اور طاقت ملے گی۔ اگر سارا ملک گوشت خوری کرنے لگ جائے تو انگریزوں کو ہٹایا جا سکتا ہے۔

میرے ماں باپ وشنو تھے اور میں ان کا بڑا عقیدت کیش تھا۔ میں جانتا تھا کہ انہیں میری گوشت خوری کا پتہ چل جائے گا تو وہ موت کے بغیر ہی فوراً زندگی سے ہاتھ دھو دیں گے۔ سچائی کو جانتے ہوئے یا ایسے ہی میں سچا سیوک تو تھا ہی۔ یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ گوشت خوری کے لیے ماں باپ سے فریب کرنا پڑے گا۔ مجھے اس بات کا اس وقت علم نہیں تھا لیکن میرا آلہ خیال تو اصلاح کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ گوشت خوری کا شوق نہیں تھا۔ ذائقہ کے خیال سے میں نے گوشت خوری کو شروع نہیں کرنا تھا۔ مجھے تو طاقتور اور حوصلہ مند بننا تھا اور دوسروں کو ویسا ہی بننے کے لیے سمجھانا تھا اور پھر انگریزوں کو شکست دے کر بھارت کو آزاد کرانا تھا۔ ”سوراجیہ“ لفظ تو اس وقت کان میں بھی نہیں پڑا تھا۔ اس ریفارم کی دھن میں اپنے ہوش سے عاری ہو گیا۔ اور پوشیدہ طور پر اس پر عمل کرنے کا انتظام کر لیا۔ اس وقت میں نے ایسے ہی اپنے جی کو سمجھایا کہ اپنی بات کو ماں باپ سے چھپانا سچائی سے بھٹکنا نہیں ہے۔

مقررہ دن آ گیا لیکن اس دن کی حالت کا بیان کرنا مشکل ہے۔ ایک طرف تھا اصلاح کا جوش اور زندگی میں ایک اہم تبدیلی پیدا کرنے کا نیا تصور اور دوسری طرف تھی چور کی مانند چھپ کر کام کرنے کی شرم۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس میں کس کو اہمیت تھی۔ ہم لوگ ندی کی طرف تنہا مقام کی تلاش میں چلے کافی دور جا کر ایسی جگہ تلاش کی جہاں کوئی اچانک دیکھ نہ پائے۔ وہاں میں نے کبھی نہ دیکھا ہو گوشت دیکھا ساتھ ہی بھٹیارے کے ہاں کی ڈبل روٹی تھی۔ مگر دونوں میں سے ایک چیز بھی اچھی نہ لگی۔ گوشت چمڑے کی مانند معلوم ہوتا تھا۔ کھانا مشکل ہو گیا۔ قے آنے لگی اور کھانا چھوڑ دینا پڑا۔

میری وہ رات بڑی مشکل سے گزری۔ کسی طرح نیند نہیں آتی تھی۔ خواب میں ایسا معلوم ہوتا تھا جس طرح بکرا میرے جسم میں زندہ ہے اور چلا رہا ہے۔ میں سخت چونک اٹھا اور پچھتایا لیکن پھر خیال آیا کہ گوشت خوری کے بغیر تو مخلصی محال ہے۔ اس طرح حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے........ گوشت خوری ہی میرا فرض ہے۔ مجھے ہمت سے کام لینا چاہیے۔

☆☆☆

باب نمبر ۵

آنکھیں کھل گئیں

دوست ہار ماننے والے نہیں تھے۔ انہوں نے اب گوشت کو مختلف طریقوں سے پکا کر لذت افروز بنانا اور قرینہ سے رکھنا شروع کیا۔ ندی کے کنارہ کی بجائے کسی باورچی سے تعلق استوار کر کے پوشیدہ طور پر حکومت کے ایک درباری ہوٹل میں لے جانے کا انتظام کیا۔ وہاں کے کھانے کے کمرہ اور میز کرسی کے ٹھاٹھ باٹھ نے مجھے مسحور کر ڈالا۔

س بات کا ٹھیک اثر پڑا۔ روٹی سے جو نفرت تھی وہ نرم پڑ گئی۔ بکرے پر رحم کا خیال کافور ہو گیا۔ اور گوشت کا نہ کہہ کر گوشت کی اشیاء کا زبان کو چسکا لگ گیا۔ ایک سال اسی طرح بیت گیا ہوگا۔ اتنے عرصہ میں کل پانچ چھ بار گوشت خوری کا موقعہ ملا ہوگا کیونکہ ہر وقت درباری ہوٹل کا انتظام مشکل تھا اور ہمیشہ گوشت کو لذیذ بنانے والی اچھی چیزیں تیار کیسے ہو سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ ایسے کھانوں پر خرچ بھی زیادہ آتا تھا۔ میرے پاس تو اپنی کوڑی بھی نہیں تھی۔ میں دیتا کیا؟ اس خرچ کا انتظام تو اس دوست کے ہی ذمہ ہوا کرتا تھا۔ مجھے آج تک پتہ نہیں کہ اس نے کیا انتظام کیا تھا۔ اس کا خیال تو مجھے گوشت سے رغبت پذیر کرنے کا تھا۔ اس لیے خرچ کا بار بھی وہ خود اٹھایا کرتا تھا۔ مگر اس کے پاس کوئی قارون کا گنج تو تھا نہیں۔ اس لیے ویسے کھانے تو کبھی کبھی ہی ممکن ہوا کرتے تھے۔

جب کبھی میں ایسے کھانوں میں شریک ہوا کرتا تھا۔ اس وقت گھر کھانا نہیں کھایا کرتا تھا۔ جب ماں کھانے کے لیے بلاتی تو بہانا بنانا پڑتا تھا۔ آج بھوک نہیں ہے۔ کھانا ہضم نہیں ہوا۔ مگر ہر ایک بہانے کے وقت میرا دل کو چوٹ لگتی تھی۔ جھوٹ اور وہ بھی ماں

کے سامنے اور پھر اگر ماں باپ جان جائیں کہ لڑکا گوشت خور ہو گیا ہے۔ تب تو ان پر بجلی ہی گر پڑے۔ یہ خیالات میرے دل کو کتر رہے تھے۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ اگرچہ گوشت خوری لازم ہے۔ اس کا پرچار ہندوستان کی اصلاح ہے مگر ماں باپ سے جھوٹ اور فریب گوشت خوری سے بھی بدتر ہے۔ اس لیے ماں باپ کے جیتے جی گوشت نہیں کھاؤں گا۔ ان کے مرنے کے بعد آزاد ہو جانے پر کھلم کھلا کھاؤں گا۔ اس وقت تک کے لیے گوشت خوری ملتوی رہے۔ یہ فیصلہ میں نے اپنے دوست کو سنا دیا۔ اس وقت سے گوشت خوری سو گئی۔ ماں باپ کو بالکل معلوم نہ ہوا کہ ان کے دو بیٹے گوشت خوری کر چکے ہیں۔

ماں سے جھوٹ اور فریب نہ کرنے کے نیک خیال سے میں نے گوشت خوری کو تو چھوڑا لیکن اس دوست کی دوستی نہ چھوڑی۔ میں دوسروں کی اصلاح کرنے چلا تھا اور خود ہی گڑھے میں گر گیا۔ مگر اس گراوٹ کا مجھے احساس تک نہ رہا۔

شاید دوست کی صحبت کی وجہ سے میں بداخلاقی میں پھنس جاتا۔ ایک بار یہ دوست مجھے چکلے میں لے گیا۔ میں مکان میں داخل تو ضرور ہوا لیکن جس کو بھگوان بچاتا ہے۔ وہ گرنا چاہتے ہوئے بھی پوتر بنا رہ سکتا ہے۔ مگر میری آنکھیں اتنے سے بھی نہ کھلیں۔ مجھے اس وقت تک اس بات کا احساس تک نہ ہوا کہ اس دوست کی دوستی ٹوٹنے والی نہیں ہے۔ ابھی اور تلخ تجربے باقی تھے۔ یہ تو مجھے بھی معلوم ہوا کہ جب میں نے اس میں یہ صاف نقص دیکھے۔ جن سے میں ان کو ملوث مانتا تھا۔

اسی زمانہ کی ایک بات کہہ دینی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے عورت مرد کے درمیان ہونے والے بھید اور فریب کی وجہ یہ دوستی بھی تھی۔ میں جتنا پریمی پتی تھا۔ اتنا وہمی بھی۔ میرا وہم بڑھانے والی یہ دوستی تھی کیونکہ دوست کی سچائی پر مجھے ذرا بھی بے اعتمادی نہیں تھی۔ اس دوست کی باتیں مان کر میں نے اپنی استری کو کتنی ہی اذیتیں دیں۔ اس جبر کے لیے میں نے کبھی اپنے آپ کو معاف نہیں کیا۔ ہندو استری ہی ایسے دکھوں کو برداشت کر سکتی ہے۔ اس لیے میں نے استری کو ہمیشہ صبر کی تصویر مانا ہے۔ نوکر پر اگر جھوٹا شک کیا جائے تو وہ نوکری چھوڑ جاتا ہے۔ بیٹے پر کیا جائے تو باپ کا گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ دوستوں میں باہم شبہات کے پیدا ہونے پر دوستی ٹوٹ جاتی ہے۔ استری کو اگر پتی پر شک

ہو تو اسے جی کو مسوس کر بیٹھا رہنا پڑتا ہے لیکن اگر مرد کا استری پر شک ہو جائے تو بچاری کی قسمت ہی پھوٹی سمجھنی چاہیے۔ وہ کہاں جائے؟ اعلیٰ خانے جاتی والی ذات کی ہندو استری عدالت میں جا کر طلاق بھی نہیں دے سکتی۔ اس کے لیے یک طرفہ انصاف رکھا گیا ہے۔ میرا سلوک ایسا تھا کہ اس کا دکھ میں کبھی بھول ہی نہیں سکتا۔

اس شک کا قطعی ازالہ تو اس وقت ہوا جب مجھے اہنسا کی لطیف حقیقت کا پتا چل گیا یعنی اس وقت جب میں نے برہم چریہ کی عظمت کو سمجھا اور سمجھا کہ عورت مرد کی داسی نہیں ہے بلکہ اس کی رفیقہ ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ایک جیسے حصہ دار ہیں اور جتنی آزادی پتی کو برا بھلا کرنے کی ہے۔ اتنی ہی استری کو بھی ہے۔ اس وقت کے شک اور تذبذب کی جب مجھے یاد آتی ہے تو مجھے اپنی بے وقوفی اور لذات کے لیے دیوانگی پر غصہ اور دوستی کے متعلق اپنے آپ پر رحم آتا ہے۔

☆☆☆

باب نمبر ۶

چوری اور پچھتاوا

جنگِ عظیم کے وقت کے اور اس سے کچھ پہلے کے اپنے چند نقائص کا ذکر ابھی باقی ہے۔ وہ یا تو بیاہ سے پہلے کے ہیں یا کچھ ہی بعد کے ہیں۔

اپنے ایک رشتہ دار کی صحبت میں مجھے سگریٹ پینے کا شوق ہوا۔ پیسے تو ہمارے پاس تھے نہیں۔ سگریٹ پینے کے کسی فائدے یا اس کی بو کے مزے سے تو ہم دونوں میں کوئی بھی جانکار نہیں تھا لیکن دھواں اڑانے میں ہی کچھ مزا آتا تھا۔ میرے چچا جی کو سگرٹ کی عادت تھی۔ انہیں اور دوسرے لوگوں کو دھواں اڑاتے ہوئے دیکھ کر ہمیں بھی "دم لینے" کا شوق ہوا۔ پیسے پاس نہ ہونے کی وجہ سے ہم نے چچا جی کی سگریٹوں کے بچے اور پھینکے ہوئے حصوں کو چرانا شروع کیا۔

لیکن یہ ٹکڑے کچھ ہمیشہ نہیں مل پاتے تھے اور ان میں سے کچھ زیادہ دھواں بھی نہیں نکل سکتا تھا۔ اس لیے نوکروں کی جیبوں میں پڑے دو چار پیسوں میں سے ہم بیچ بیچ میں ایک آدھ پیسہ چرانے لگے۔ اور اس سے سگریٹ پینے لگے لیکن چھپا کر رکھنے کا معاملہ سامنے آیا۔ اتنا خیال تھا کہ بڑے بوڑھوں کے سامنے سگریٹ پینا ممکن نہیں ہے۔ جیسے بھی ہوتا دو چار پائی پیسے چرا کر کچھ ہفتے کام چلایا۔ اسی اثناء میں سنا کہ ایک پودا (اس کا نام بھول گیا) ہوتا ہے جس کا ڈنٹھل سگرٹ کی طرح جلتا ہے اور وہ پیا جا سکتا ہے۔ ہم نے وہ لا کر دھواں اڑانا شروع کیا۔

لیکن ہمیں تسکین نہ ہوئی۔ اپنی غلامی ہمیں بری محسوس ہونے لگی اور یہ مشکل ہو گیا

کہ بڑوں کے حکم کے بغیر کچھ بھی نہ ہو سکے۔ ہم پریشان ہو گئے اور خودکشی کا ارادہ کر لیا۔

لیکن خودکشی کیسے کریں؟ زہر کہاں سے لائیں؟ ہم نے سنا کہ دھتورے کے بیج سے موت آ جاتی ہے۔ جنگل سے گھوم پھر کر بیج لائے، کھانے کا وقت شام کو مقرر تھا۔ کیدار جی کے مندر کی دیپ مالا میں گھی چڑھایا، درشن کیے اور پھر تنہائی میں پہنچے۔ مگر زہر کھانے کی ہمت نہ پڑی۔ اگر فی الفور موت نہ ہوتو؟ مرنے سے کون سا فائدہ ہوگا؟ غلامی میں ہی کیوں نہ پڑے رہیں۔ اس قسم کے خیالات جی میں آنے لگے۔ مگر پھر بھی دو چار بیج کھا ہی ڈالے لیکن زیادہ کھانے کی ہمت نہ پڑی۔ ہم دونوں موت سے ڈر گئے۔ فیصلہ کیا کہ چل کر رام جی کے مندر میں درشن کریں اور اطمینان سے بیٹھیں اور خودکشی کی بات ذہن سے دور کر ڈالیں۔

اس وقت میں نے سمجھا کہ خودکشی کا خیال کر لینا آسان ہے لیکن خودکشی کرنا آسان۔ اس لیے جب کوئی خودکشی کرنے کی دھمکی دیتا ہے تو مجھ پر اس کا بہت کم اثر ہوتا ہے یا یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ بالکل نہیں ہوتا۔

خودکشی کے فیصلہ کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری جوٹھی سگریٹ چرا کر پینے کی، نوکروں کے پیسے چرانے کی اور اس سے سگریٹ خرید کر پینے کی عادت ہی جاتی رہی۔ بڑا ہونے پر مجھے کبھی سگریٹ پینے کی خواہش ہی نہ ہوئی اور میں ہمیشہ اس عادت کو گنوار پن، نقصان دہ اور گندی مانتا آیا ہوں۔ اب تک میں یہ سمجھ ہی نہیں پایا کہ سگریٹ، بیڑی کا اتنا بڑا زبردست شوق دنیا میں کیوں ہے؟ ریل کے جس ڈبے میں بیڑی سگریٹ کا دھواں اڑتا ہے وہاں بیٹھنا میرے لیے مشکل ہو جاتا ہے اور اس کے دھواں سے میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔

سگرٹوں کے ٹکڑے اور اس کے لیے نوکروں کے پیسے چرانے کے جرم کے علاوہ ایک اور جو چوری کا مرتکب میں بن پڑا اسے میں زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ سگریٹ کے جرم کے دنوں میں میری عمر بارہ تیرہ سال کی ہوگی۔ شاید اس سے بھی کم ہو۔ دوسری چوری کے وقت پندرہ سال کی رہی ہوگی۔ یہ چوری تھی میرے گوشت خور بھائی کے سونے کے کڑے سے ٹکڑے چرانے کی۔ انہوں نے کوئی پچیس روپے لگ بھگ قرض لیا تھا۔ ہم دونوں بھائی اس کی ادائیگی کے چکر میں تھے۔ میرے بھائی کے ہاتھ میں سونے کا ایک ٹھوس کڑا تھا۔ اس میں سے تولہ بھر سونا کاٹ لینا کوئی مشکل نہیں تھا۔

کڑا کاٹ کر قرض ادا کر دیا گیا لیکن میرے لیے یہ بات بھی ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ میں نے آئندہ چوری نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ بھی سوچا کہ پتا جی کے سامنے اس بات کا اقرار کرنا چاہیے لیکن زبان کھلنی مشکل تھی۔ یہ ڈر تو نہیں تھا کہ پتا جی مجھے پیٹیں گے کیونکہ یاد نہیں پڑتا کہ انہوں نے ہم بھائیوں میں سے کسی کو کبھی مارا ہو لیکن یہ خوف ضرور تھا کہ وہ خود بڑے دکھی ہوں گے اور شاید اپنا سر نوچ ڈالیں گے؟ مگر پھر سوچا کہ اس خطرہ کو مول لے کر بھی تو اپنا جرم قبول کرنا ہی مناسب ہے اور ایسا معلوم ہوا کہ اس کے بغیر شدھی نہیں ہو گی۔

آخر کار میں نے ایک خط لکھ کر جرم کا اقبال کرتے ہوئے معافی مانگنے کا فیصلہ کیا۔ خط میں سارا جرم تسلیم کیا تھا اور سزا مانگی تھی۔ اس کے لیے یہ استدعا کی کہ میرے جرم کے لیے اپنے آپ کو تکلیف میں نہ ڈالیں اور اقرار کیا کہ آئندہ ایسا جرم نہیں کروں گا۔

میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے یہ خط پتا جی کو دیا۔ میں ان کے تخت کے سامنے بیٹھ گیا۔ ان دنوں بھگندر کی بیماری زوروں پر تھی۔ اس لیے وہ بستر پر ہی دراز رہا کرتے تھے۔ اور کھاٹ کی بجائے تخت کو کام میں لاتے تھے۔

انہوں نے خط پڑھا۔ آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ خط بھیگ گیا۔ تھوڑی دیر کے لیے انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور خط پھاڑ ڈالا اور خط پڑھنے کے لیے بیٹھے ہوئے تھے کہ پھر لیٹ گئے۔

میں بھی رویا۔ پتا جی کے درد کو میں نے محسوس کیا اگر میں مصور ہوتا تو آج بھی وہ تصویر اسی صورت میں تیار کر کے رکھ دیتا۔ میری آنکھوں کے سامنے آج بھی وہ نظارہ رقص کناں ہے۔

ان گرتے ہوئے آنسوؤں کے بان نے مجھے زخمی کر ڈالا۔ میں شدھ ہو گیا۔ اس محبت کو تو وہی جان سکتا ہے جس کو اس کا احساس ہوا ہے۔

دام بان واگیا رے ہوئے تے جانے

میرے لیے یہ اہنسا کا لفظی درس تھا۔ اس وقت تو مجھے پدری محبت کا ہی احساس ہوا تھا لیکن آج میں اسے شدھ رہنے کا نام دے سکتا ہوں۔ ایسی اہنسا کی عالمگیری شکل اختیار کرنے پر اس سے کون اچھوتا رہ سکتا ہے؟ ایسی عالمگیر اہنسا کی قوت کا اندازہ لگانا

طاقت سے بعید ہے۔

وہ تسکین افروز معافی پتا جی کی عادت کے خلاف تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ یہ غصہ ہوں گے، پھٹکار دیں گے۔ شاید اپنا سر پیٹ لیں لیکن انہوں نے بے حد اطمینان کا ثبوت دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ جرم کا سچے دل سے تسلیم کرنے کا نتیجہ تھا جو انسان اپنی مرضی سے اپنے قصور سچے دل سے مان لیتا ہے اور آئندہ کبھی نہ کرنے کا اقرار کرتا ہے وہ سکھ پاتا ہے کہ میرے اس اقرار سے پتا جی میرے متعلق اس معاملے میں بے خوف ہو گئے اور ان کی محبت میرے ساتھ اور بھی بڑھ گئی۔

☆☆☆

باب نمبر ۷

دھرم کی جھلک

راج کوٹ میں مجھے ہر ایک فرقہ سے رواداری کی تربیت ملی تھی۔ میں نے ہندو دھرم کے ہر ایک فرقہ سے رواداری رکھنے کی تعلیم پائی کیونکہ ماتا پتا وشنو مندر شوآلیہ اور رام مندر میں بھی جاتے اور ہم بھائیوں کو بھی لے جاتے اور بھیجتے تھے۔

اس کے علاوہ پتاجی کے پاس ایک نہ ایک جین دھرم آچاریوں میں سے کوئی نہ کوئی ہمیشہ آتے رہتے۔ پتاجی بھکشا دے کر ان کی آؤ بھگت بھی کیا کرتے تھے۔ وہ پتاجی کے ساتھ دھرم اور دیوہار چرچا بھی کیا کرتے تھے۔ کئی بار وہ اپنے اپنے دھرم کی باتیں سنایا کرتے اور پتاجی آورادر محبت کے ساتھ ان کی باتیں سنتے۔ ایسے ذکر اذکار کے وقت میں ان کا خدمت گار ہونے کی وجہ سے عموماً موجود رہتا تھا۔ اس سارے کرہ ہوائی کے اثر سے میرے آلہ خیال میں تمام دھرموں کی عزت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

اس طرح میرے جی میں دوسرے دھرموں سے عزت کا خیال آیا لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس وقت مجھے ایشور کی ہستی کا بھی احساس تھا۔ مگر ایک بات نے میرے دل میں گھر کر لیا وہ یہ کہ دنیا حکمت عملی پر انحصار رکھتی ہے اور حکمت واحد تر حقانیت پر منجر ہے۔ مگر حق کی تلاش تو ابھی باقی ہے۔ دن بدن حق کی عظمت میرے خیال میں بڑھتی گئی اور حق کی شرح توضیح اختیار کرتی گئی اور اب بھی بڑھتی جا رہی ہے۔

اس وقت حکمت عملی کے متعلق ایک مخمس میرے جذبات پر غالب آیا۔ بدی کا بدلہ بدی نہیں بلکہ بھلائی ہی ہونا چاہیے۔ یہ بات رشتہ زندگی بن گئی۔ اس نے میرے دل پر

اپنا اثر چلانا شروع کر دیا۔ بدی کا بدلہ چاہنا اور کرنا اس کا میں معتقد بن گیا۔ اس کے بے انداز تجربے کئے۔ ایسا چھنکاری مخمس یہ ہے۔

پانی اپنے پائے بھلوں بھوجن تو دیجئے
آدمی نماوئے ششی ونڈوت کوڑے کیجئے
آپن گھاسے دام کام موہر ینوں کریئے
آپ اگارے پر ان تے تنا دکھ ماں مریئے
گن کیٹرے تو گن دس گنوں من واچا کرے کریئے
او گن کیٹرے جن گن کوے تے جگ میں جیتو سہی

یعنی جو اپنے کو جل پان کرائے اسے بھلا بھوجن تو دیجئے اور جو اپنے سامنے سر جھکا کے اسے پرنام کیجئے۔ جو شخص تمہارا ایک پیسہ بھر کام کرے اس کے عوض میں ایک اشرفی بھر اس کا کام کرنے کی کوشش کریں جو آدمی تمہاری زندگی بچائے ان کی مصیبت کے وقت اولین مددگار رہیں۔ ایک کی بجائے دس گناہ نیکی کریں اور دل سے چاہنے والوں کی ہمدردی میں دریغ نہ کریں اور برائی کرنے والے کی تعریف کریں۔ دراصل وہی دنیا کے فاتح ہیں جو نیک اعمال ہیں۔

☆☆☆

باب نمبر ۸

تین اقرار

۱۸۸۷ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس وقت بمبئی اور احمد آباد دو امتحانات کے سنٹر تھے۔ ملک کے تو ایسے عام گھرانوں کی غربت کی یہ حالت تھی کہ میرے جیسے حالات کے کاٹھیاواڑی کو قریبی اور سستے احمد آباد کو پسند کرنا فطرتی تھا۔ راج کوٹ سے احمد آباد کا یہ میں نے پہلا سفر کیا تھا۔

بزرگوں کی یہ خواہش تھی کہ پاس ہو جانے پر آگے کالج میں پڑھوں کالج بمبئی اور بھاؤنگر میں تھا لیکن کفایت شعاری کے خیال سے بھاؤنگر کے شاملداس کالج میں پڑھنے کا فیصلہ ہوا۔ وہاں ہر ایک کام مجھے مشکل معلوم ہونے لگا۔ پروفیسروں کے لیکچروں میں مجھے لطف نہیں ملتا تھا۔ اور نہ ہی وہ سمجھ میں آتے۔ اس میں پروفیسروں کا قصور نہیں تھا بلکہ میری پڑھائی ہی کم تھی۔ اس وقت کے شاملداس کالج کے پروفیسر تو اعلیٰ درجہ کے خیال کئے جاتے تھے۔ چنانچہ ان حالات میں ہی پہلا ٹرم پورا کر کے گھر آیا۔

ہمارے قبیلہ کے پرانے رفیق اور مشیر ایک دوودان اور سیانے برہمن ماؤجی دیو تھے۔ انہوں نے ہمیں مشورہ دیا اب وہ زمانہ بدل گیا ہے تم بھائیوں میں سے اگر کوئی کابا گاندھی کی گدی لینا چاہے تو وہ تعلیم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ میری رائے ہے کہ موہن داس کو آپ اسی سال ولایت بھیج دیں۔ وہاں تین سال رہ کر بیرسٹر بن جائے گا اور پھر میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

"کیوں تمہیں ولایت جانا پسند ہے یا یہیں پڑھتے رہنا؟"

"مجھے تو جو بھاوے وہی بتاوے۔" میں کالج کی مشکلات سے ویسے ہی تنگ آیا ہوا تھا۔ میں نے کہا ولایت بھیجیں تو بہت ہی اچھا ہوگا لیکن بڑے بھائی الجھن میں پڑ گئے۔ خرچ کا کیا انتظام ہوگا اور پھر اس عمر میں اتنی دور کیسے بھیج دیں۔

ماتا جی کو کچھ نہ سوجھا۔ دور بھیجنے کی بات انہیں پسند نہ آئی۔ اس نے ولایتی زندگی کے متعلق حالات دریافت کرنے شروع کئے۔ کوئی کہتا تھا۔ نوجوان ولایت جا کر بگڑ جاتے ہیں۔ کوئی کہتا تھا گوشت کھاتے ہیں۔ کوئی کہتا وہاں شراب کے بغیر کام نہیں چلتا۔ ماں نے مجھے یہ سب باتیں سنائیں میں نے سمجھایا کہ "تم مجھ پر یقین رکھو۔ میں وشواس گھات نہیں کروں گا۔ قسم کھاتا ہوں کہ میں ان تینوں برائیوں سے بچا رہوں گا اور اگر ایسی مشکلات ہوتیں تو جوشی جی کیوں جانے کی صلاح دیتے؟"

ماتا جی نے کہا "مجھے تم پر یقین ہے لیکن دور دیش میں تیرا کیسے کیا بنے گا؟ میری تو عقل کام نہیں کرتی۔ میں بیچر جی سوامی سے دریافت کروں گی۔"

بیچر جی سوامی موڑھ بنیے تھے۔ جو جین سادھو ہو گئے تھے۔ جوشی جی کی طرح وہ ہمارے صلاح کار بھی تھے۔ انہوں نے میری مدد کی انہوں نے کہا "میں اس سے تین چیزوں کے لیے قسم لوں گا۔ پھر اس کے جانے میں کوئی ہرج نہیں ہوگا۔" چنانچہ اسی کے مطابق میں نے گوشت شراب اور عورتوں سے دور رہنے کی قسم دے دی۔

میرے ولایت جانے کی تقریب میں ہائی سکول میں طالب علموں کی مجلس ہوئی۔ راج کوٹ کا ایک نوجوان ولایت جا رہا ہے۔ اس سے سب حیران تھے۔ میں کچھ جوابی تقریر لکھ کر لے گیا تھا۔ مگر میں اسے مشکل سے پڑھ سکا۔ اتنا مجھے یاد ہے کہ سر چکرا رہا تھا اور بدن کانپ رہا تھا۔

☆☆☆

باب نمبر۹

پہلا تجربہ

میں ۴ ستمبر ۱۸۸۸ء کو بمبئی کی بندرگاہ سے چلا۔ جہاز میں مجھے کوئی بھی سمندری تکلیف نہ اٹھانی پڑی لیکن جوں جوں دن گزرتے جاتے تھے۔ میں پریشان ہوتا جاتا تھا۔ سٹوارٹ (جہاز کے باورچی) کے ساتھ بولتے ہوئے جھینپتا تھا۔ کیونکہ انگریزی میں بات چیت کرنے کی عادت نہیں تھی۔ میرے ایک رفیق جوراج کوٹ کے وکیل تھے۔ اور بیرسٹر بننے والایت جارہے تھے اور مزومدار کو چھوڑ کر باقی سب مسافر انگریز تھے۔ ان کے سامنے بولتے نہ بنتی تھی۔ وہ میرے ساتھ بولنے کی کوشش کرتے تو ان کی باتیں میری سمجھ میں نہ آتی تھیں اور اگر سمجھ بھی لیتا تو جواب نہیں سوجھتا تھا۔ ہر ایک جملہ بولنے سے پہلے دل میں جمالیا کرتا تھا۔ چھری کانٹے سے کھانا نہیں آتا اور یہ پوچھنے کا حوصلہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ اس میں گوشت کے بغیر کون کون سی چیزیں ہیں؟ اسی لیے میں کھانے کی میز پر تو کبھی گیا ہی نہیں۔ کیبن کی کوٹھڑی میں ہی کھالیتا تھا اور اپنے ساتھ جو مٹھائیاں وغیرہ لے گیا تھا۔ انہیں پر گزر کی۔ مزومدار کو تو کوئی جھجک نہیں تھی۔ وہ سب کے ساتھ ہل مل گئے۔ ڈیک پر بھی جہاں جی چاہے گھومتے پھرتے تھے۔ مگر میں دن بھر کیبن میں ہی پڑا رہتا۔ ڈیک پر جب لوگوں کی بھیڑ کم دیکھتا تو تھوڑی دیر کے لیے وہاں جا کر بیٹھ آتا۔ مزومدار مجھے سمجھاتے کہ سب کے ساتھ ملنا چاہیے اور کہنے کو وکیل کو باتونی ہونا چاہیے۔ وکیل کی حیثیت سے وہ اپنا تجربہ بھی سناتے۔ کہتے کہ انگریزی ہماری مادری زبان نہیں ہے۔ بولنے میں غلطیاں ہوں گی۔ اس لیے جھجکنا نہیں چاہیے۔ لیکن میں اپنی بزدلی کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔

مجھ پر رحم کھا کر ایک بھلے انگریز نے میرے ساتھ بات چیت کرنا شروع کیا۔ میں کیا کھاتا ہوں۔ کون ہوں، کہاں جا رہا ہوں، کیوں کسی کے ساتھ بات چیت نہیں کرتا؟ وغیرہ سوال پوچھے۔ مجھے کھانے کے لیے ساتھ آنے کو کہا اور میرا گوشت خوری سے اعراض سن کر وہ مسکرائے اور مجھ پر ترس کھا کر بولے یہاں (پورٹ سعید) پہنچنے سے پہلے سب اچھی طرح ہے۔ لیکن خلیج بسکے میں پہنچنے پر تمہیں اپنے خیالات کو تبدیل کرنا پڑے گا۔ انگلینڈ میں تو اتنی سردی پڑتی ہے کہ گوشت کے بغیر کام چل ہی نہیں سکتا۔

میں نے کہا ”میں نے سنا ہے کہ وہاں لوگ گوشت کھائے بغیر بھی رہ سکتے ہیں۔“

وہ بولے ”یہ جھوٹ ہے۔ میرے جانکاروں میں کوئی سبزی خور نہیں ہے۔ میں تمہیں شراب پینے کے لیے نہیں کہتا لیکن میں سمجھتا ہوں گوشت تو تمہیں ضرور کھانا چاہیے۔“

میں نے کہا ”آپ کے مشورہ کے لیے میں ممنوں ہوں لیکن گوشت نہ کھانے کا ماں کے سامنے اقرار کر چکا ہوں۔ اگر اس کے بغیر گزارہ نہیں ہو سکتا تو میں ہندوستان واپس چلا جاؤں گا لیکن گوشت نہیں کھاؤں گا۔“

خلیج بسکے آ گئی۔ وہاں بھی نہ تو مجھے گوشت کی ضرورت محسوس ہوئی اور نہ شراب کی۔ دکھ سکھ برداشت کرتے ہوئے سفر پورا کر کے ساؤتھمپٹن بندرگاہ پر آ پہنچے۔ مجھے یاد آتا ہے اس روز سنیچر تھا۔ میں جہاز پر کالے کپڑے زیب تن کیا کرتا تھا۔ دوستوں نے مجھے سفید فلالین کا سوٹ بھی بنوا دیا تھا۔ ولایت میں اترنے پر اسے پہننے کا فیصلہ کیا۔ یہ سمجھ کر کہ سفید کپڑے زیادہ اچھے لگیں گے۔ یہ سوٹ پہن کر میں جہاز سے اترا۔ ستمبر کے آخری دن تھے۔ ایسے کپڑوں میں اکیلے ہی میں نے اپنے آپ کو پایا۔ میرے صندوق اور ان کی چابیاں گرینڈلے کمپنی کا ایجنٹ لے گیا تھا۔ یہ سمجھ کر میں نے اپنی تالیاں بھی انہیں دے دی تھیں۔

میرے پاس چار تعارفی چٹھیاں تھیں ایک ڈاکٹر پران جیون مہتہ کے نام دوسری دلپت رام شکل کے نام تیسری پرنس رنجیت سنگھ کے نام اور چوتھی دادا بھائی ناروجی کے نام۔ کسی نے صلاح دی تھی کہ وکٹوریہ ہوٹل میں ٹھہرنا بہتر ہوگا۔ اس لیے مزمودار اور میں وہاں گئے۔ میں تو اپنے سفید لباس ہونے کی وجہ سے ہی دبا جا رہا تھا اور پھر ہوٹل میں جا کر پتہ چلا کہ کل اتوار ہونے کی وجہ سے سوموار تک گرینڈلے کے ہاں سے سامان نہیں آئے گا۔ اس

لیے میں سخت پریشانی میں پڑ گیا۔

میں نے ساؤتھمپٹن سے ہی ڈاکٹر مہتہ کو تار دے دیا تھا۔ وہ سات آٹھ بجے آئے۔ انہوں نے محبت بھرے انداز میں مخول کیا۔ باتوں باتوں میں میں نے انجانے سے ان کی ریشمی برادر ٹوپی دیکھنے کے لیے اٹھالی اور اس پر الٹا ہاتھ پھیرنے لگا۔ ٹوپی کی پر سیدھی ہوگئی۔ ڈاکٹر مہتہ نے دیکھا تو فوراً ہی مجھے روکا لیکن قصور تو ہو چکا تھا۔ ان کے روکنے کا اس قدر ہی نتیجہ ہوا کہ مستقبل میں ایسی غلطی نہ ہو۔

یہاں سے ہی یوروپین رسم ورواج کی ابتدا ہوئی۔ ڈاکٹر مہتہ ہنس ہنس کر کئی باتیں سمجھاتے جاتے تھے۔ کسی چیز کو چھونا نہیں چاہیے‘ کسی سے جان پہچان ہوتے ہی ہندوستان میں جو باتیں آسانی سے دریافت کی جاسکتی ہیں‘ وہ یہاں نہیں پوچھنی چاہئیں۔ باتیں کرتے ہوئے زور سے نہیں بولنا چاہیے۔ ہندوستان میں صاحبوں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے سر کہنے کا جو رواج ہے وہ یہاں ضروری نہیں ہے۔ سر تو نوکر اپنے مالک کو یا اپنے افسر کو کہتا ہے۔ پھر انہوں نے ہوٹل میں رہنے کے خرچ پر بھی باتیں کیں اور بتایا کہ کسی پریوار کے ساتھ رہنا بہتر ہوگا۔ اس سلسلہ میں زیادہ تر خیالات کا اظہار سوموار کے لیے ملتوی رہا۔

ہوٹل تو ہم دونوں کو ”سانست گھر“ کی مانند معلوم ہوا۔ یہ ہوٹل تھا بھی مہنگا۔ مالٹا سے ایک سندھی سجن سوار ہوئے تھے۔ ان سے مزمودار کی اچھی بن گئی تھی۔ یہ سندھی مسافر لندن کے اچھے واقف تھے۔ انہوں نے ہمارے لیے کرایہ پر دو کمرے لینے کا بار اپنے اوپر لیا۔ ہم نے مان لیا اور سوموار کو سامان ملتے ہی ہوٹل کا بل ادا کر کے ان سندھی دوست کو لئے ہوئے کمروں میں چلے گئے۔ مجھے یاد ہے کہ ہوٹل کا بل لگ بھگ تین پونڈ میرے حصہ میں آیا تھا۔ میں حیران رہ گیا۔ تین پونڈ دے کر بھی بھوکا ہی رہا۔ وہاں کا کوئی کھانا بھی اچھا نہ لگا۔ ایک چیز وہ لی وہ پسند نہ آئی پھر دوسری لی۔ مگر رقم تو دونوں کی ادا ہی کرنی پڑی۔ میں ابھی تک قریباً بمبئی سے لائے ہوئے کھانے کے سامان پر ہی دن کاٹ رہا تھا۔

اس کمرے میں بھی میں پریشان حال ہی رہا۔ دیش بڑا یاد آتا تھا۔ ماں کی محبت آنکھوں کے سامنے ناچتی تھی۔ رات ہوتے ہی رونا شروع کر دیتا۔ گھر کی کئی قسم کی باتیں یاد آتیں۔ اس میں نیند بھلا کہاں آسکتی تھی؟ اپنی یہ داستان مصیبت کسی سے کہہ بھی تو نہیں سکتا

تھا۔ کہنے سے فائدہ ہی کیا تھا۔ میں خود نہیں جانتا تھا کہ میری کس سے تسلی ہوگی۔ لوگ عجیب وغریب ہیں۔ رہن سہن نرالی‘ مکان بھی عجیب اور گھروں میں رہنے کا طور طریقہ بھی الگ تھا۔ پھر یہ بھی اچھی طرح معلوم نہیں تھا کہ کیا بولنے سے اور کیا کرنے سے یہاں افعال حسنہ کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کھانے پینے کا پرہیز الگ اور جن چیزوں کو میں کھا سکتا تھا وہ خشک معلوم ہوتی تھیں۔ اس لیے میری حالت سانپ چھچھوندر کی مانند ہوگئی۔ ادھر ولایت میں جی نہیں لگتا تھا۔ ادھر وطن کو بھی واپس نہیں جاسکتا تھا مگر ولایت آیا تو تین سال بتانے کے ارادہ سے ہی تھا۔

☆☆☆

باب نمبر۱۰

حفاظت

ڈاکٹر مہتہ سوموار کو وکٹوریہ ہوٹل میں مجھ سے ملنے گئے۔ وہاں انہیں ہمارے نئے مکان کا پتہ چلا۔ جب وہ وہاں آئے اور ہمارا کمرہ وغیرہ دیکھا تو سر ہلایا۔ یہ جگہ کام کی نہیں ہے۔ اس دیش میں آ کر محض کتابوں کے مطالعہ کے بجائے تجربہ حاصل کرنا زیادہ ضروری ہے۔ اس لیے کسی قبیلہ میں رہنے کی ضرورت ہے لیکن فی الحال کچھ باتیں سیکھنے کے لیے بطور امیدوار کے یہاں رہنے کا میں نے فیصلہ کیا ہے۔ میں تمہیں ان کے یہاں لے چلوں گا۔

میں نے شکریہ سے اس کی بات مان لی اور ڈاکٹر مہتہ کے ساتھ اس دوست کے ہاں گیا۔ انہوں نے میری خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔ مجھے بھائی کی طرح رکھا۔ انگریزی رسم و رواج سکھائے۔ انگریزی میں بات چیت کرنے کی انہوں نے ہی عادات ڈلوائی۔

لیکن میرے کھانے کا سوال بڑا مشکل ہو گیا۔ نمک' مرچ' مصالحہ کے بغیر ساگ نہیں بھاتا تھا۔ مالکن بیچاری میرے لیے پکاتی بھی کیا۔ سویرے تو جئی کا دلیہ بناتی۔ اس سے پیٹ بھر جاتا۔ لیکن دوپہر اور شام کو ہمیشہ بھوکا رہتا۔ دوست روزانہ گوشت کھانے کے لیے مجھے سمجھاتے مگر میں قسم کی بات کہہ کر چپ ہو رہتا۔ وہ روزانہ دلیلیں دیا کرتے۔ سو دکھوں کو دور کرنے والی ایک دوا۔ نہیں' میرے پاس تھی۔ دوست جوں جوں مجھے سمجھاتے میرا ارادہ پختہ ہوتا جاتا۔ روزانہ میں ایشور سے حفاظت کی پراتھنا کیا کرتا تھا اور روزانہ وہ پوری ہوا کرتی۔ میں یہ تو نہیں جانتا تھا کہ ایشور کیا چیز ہے لیکن عقیدت اپنا کام کر رہی تھی۔

ایک دن اس دوست نے میرے ساتھ بنتھیم کی کتاب پڑھنی شروع کی۔ ضروریات کے موضوع کا مطالعہ کیا۔ میں گھبرایا۔ زبان اعلیٰ پایہ کی تھی۔ بڑی مشکل سے سمجھتا تھا۔ انہوں نے اس کی توضیع کر دی۔ میں نے جواب دیا۔ معافی کا طالب گار ہوں۔ میں اتنی لطیف باتیں نہیں سمجھ سکتا۔ میں گوشت کھانے کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہوں لیکن میں قسم کی گرہ کو توڑ نہیں سکتا اور اس سلسلہ میں بحث بھی نہیں کرنا چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ دلائل میں میں آپ سے جیت نہیں سکتا۔ لیکن مجھے مورکھ خیال کر کے یا ضدی خیال کر کے اس کام کے لیے مجھے معاف کیجیے۔ میں آپ کی محبت کا قائل ہوں اور آپ کے مقصد کو جانتا ہوں اور آپ کو میں اپنا پورا پورا ہمدرد مانتا ہوں اور یہ بھی دیکھتا ہوں کہ آپ کو میری حالت پر دکھ ہوتا ہے لیکن میں مجبور ہوں۔ قسم نہیں ٹوٹ سکتی۔"

دوست دیکھتے رہ گئے۔ انہوں نے کتاب بند کر دی۔ بس اب میں دلیل نہیں دونگا۔ کہہ کر خاموش ہو رہے اور میں خوش ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے بحث کرنا بند کر دیا۔ لیکن میرے متعلق ان کا فکر دور نہ ہوا۔ وہ سگریٹ پیتے تھے۔ شراب نوشی کرتے تھے لیکن ان میں سے ایک کے لئے بھی مجھے مجبور نہیں کیا الٹا اسے نہ کرنے کی ہدایت دی لیکن ان کا سارا فکر تو یہ تھا کہ گوشت خوری کے بغیر میں کمزور ہو جاؤں گا اور انگلینڈ میں آزادی سے نہیں رہ سکوں گا۔

اس طرح ایک ماہ تک میں نو آموز بن کر رہا۔

☆☆☆

باب نمبر ۱۱

مہذب بننے کی کوشش

اب تک میرے متعلق دوست کا فکر دور نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے محبت کے زیرِ اثر یہ مان لیا تھا کہ گوشت نہ کھانے سے کمزور ہو جاؤں گا اتنا ہی نہیں بلکہ "بھوندو" رہ جاؤں گا۔ کیونکہ گوشت نہ کھانے سے انگریزی سماج میں مل جل نہیں سکوں گا۔ میرے ویجیٹیرین کتابوں کے شوق کا انہیں پتہ تھا۔ انہیں شک ہوا کہ ان مضامین کو پڑھ کر میں سنک جاؤں گا۔ اور میری زندگی تجربات میں رائیگاں ہو جائے گی اور فرائض سے بے بہرہ رہوں گا یا پڑھا لکھا مورکھ ہی رہوں گا۔

لیکن اب میرے جی میں آیا کہ مجھے ان کی پریشانی دور کر دینی چاہیے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں اپنے آپ کو جنگلی نہیں کہلانے دوں گا۔ بلکہ مہذبانہ خصائل کا حامل بنوں گا اور دوسری طرح سے سماج میں شامل ہونے کے قابل بن کر اپنے ویجیٹیرین ہونے کی تعجب زائی پر پردہ ڈالوں گا۔ اس لیے اب میں نے انگریزی تہذیب سیکھنے کا راستہ پکڑ لیا۔

میرا لباس تھا تو ولایتی مگر بمبئی کٹ کا تھا۔ وہ اعلیٰ انگریز سماج میں موزوں نہیں رہے گا۔ اس خیال سے "امی اور نیوی" سٹور میں دوسرے کپڑے بنوائے۔ سیدھے اور فراخ دل بڑے بھائی سے خاص طور پر دونوں جیبوں میں لٹکائی جانے والی اصلی طلائی چین منگوائی اور وہ گئی۔ مجھے ٹائی پہننے کا شوق نہیں تھا۔ اس لیے ٹائی باندھنے کی ترکیب سیکھی۔ گھر میں تو آئینہ صرف جماعت کے دن ہی دیکھنے کا موقعہ پڑتا تھا لیکن یہاں تو بڑے آئینہ کے سامنے کھڑے رہ کر ٹائی ٹھیک باندھنے میں اور بالوں کی پٹی ٹھیک کرنے اور مانگ

نکالنے میں دس منٹ کے قریب برباد ہوتے۔ ادھر میرے بال ملائم نہیں تھے۔ انہیں اچھی طرح سنوار کر رکھنے میں برش کے ساتھ روزانہ جنگ ہوا کرتی تھی اور ٹوپی پہنتے اور اتارتے وقت ہاتھ تو جس طرح مانگ سنوارنے کے لیے سر پر پہنچتے ہی رہتے۔ اس کے علاوہ جب کبھی مہذب سماج میں بیٹھتا تو مانگ پر ہاتھ پھیر کر بالوں کو درست رکھنے کا مہذب عمل ہوتا ہی رہتا تھا۔

لیکن اتنی ٹیپ ٹاپ پر ہی بس نہیں تھا۔ اکیلے مہذبانہ لباس سے کوئی تھوڑے ہی مہذب ہو جاتا ہے؟ اس لیے تہذیب کی اور بھی کئی اوپر اوپر کی باتیں معلوم کر لی تھیں۔ اب ان میں کچھ دسترس پیدا کرنی تھی۔ مہذب آدمی کو رقص سے جانکاری ہونی چاہیے۔ فرنچ زبان اچھی طرح آنی چاہیے کیونکہ فرنچ ایک تو انگلینڈ کے پڑوسی فرانس کی زبان تھی دوسرے سارے یورپ کی قومی زبان بھی تھی اور پھر میرا یورپ کی سیاحت کا بھی ارادہ تھا۔ اس کے علاوہ مہذب آدمی کے سامنے چرب زبانی کی دسترس بھی ہونی چاہیے۔ میں نے فنِ رقص کو سیکھنے کا فیصلہ کر لیا اور کلاس میں داخل ہو گیا۔ ایک سہ ماہی کی تین پونڈ کے قریب فیس دی اور کوئی تین ہفتوں میں پانچ چھ سبق پڑھے ہوں گے مگر تال پر اچھی طرح پاؤں نہیں پڑتے تھے۔ پیانو بجتا تھا مگر یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ ایک 'دو' تین کا سلسلہ چلتا۔ مگر ان کا درمیانی سلسلہ تو اس باجے سے ہی چلتا تھا جو میرے لیے از حد مشکل تھا۔ تو پھر؟ پھر تو باباجی کی بلی والی بات ہوئی۔ چوہوں کو بھگانے کے لیے بلی اور بلی کے لئے گائے۔ آہستہ آہستہ باباجی کا پریوار بڑھا۔ سوچا وائلن بجانا سیکھ لوں تو سر اور تال کا پتہ چل جائے گا۔ تین پونڈ وائلن خریدنے پر برباد کئے اور اسے سیکھنے کے لیے بھی ہاتھ سے کچھ دیا وار فنِ تقریر کا درس لینے کے لیے تیسرے استاد کے گھر کی تلاش کی۔ اسے بھی ایک پونڈ عطا کرنا پڑا۔ اس کی تحریک سے بیل کا سٹنڈرڈ ایلکیوشنسٹ خریدا اور پٹ کی تقریر سے آغاز ہوا۔

یہ دیکھ کر بیل صاحب نے میرے کانوں میں گھنٹی بجائی اور میں بیدار ہو گیا۔ کیا مجھے انگلینڈ میں زندگی بسر کرنی ہے؟ لچھے دار تقریریں سیکھ کر بھی کیا کروں گا؟ اور ناچ سیکھ کر بھی میں کس حد تک مہذب بن جاؤں گا؟ وائلن تو دیش میں جا کر بھی سیکھا جا سکتا ہے۔ میں تو طالب علم ہوں مجھے تو کسب علوم سے سروکار رکھنا چاہیے۔ اپنے اخلاق سے میں با اخلاق

سمجھا جاؤں تو البتہ درست ہو سکتا ہے نہیں تو مجھے یہ کالج چھوڑ دینا چاہیے۔

اسی دھن میں متذکرہ صدر عندیے کا خط میں نے اپنے مقرر ماسٹر کو لکھ بھیجا۔ اس سے میں نے دو یا تین سبق ہی لیے تھے۔ رقص سکھانے والے کو بھی ایسا ہی خط لکھ دیا اور وائلن سکھانے والے کے پاس وائلن لیجا کر پہنچا اور اسے کہا کہ جتنے میں بک سکے اسے بیچ دو۔ اس سے کچھ دوستی سی بن گئی تھی۔ اس لیے میں نے اس کو اپنی محبت کا ذکر بھی بیان کیا۔ ناچ وغیرہ کے بکھیڑا سے آزاد ہو جانے کی بات اسے بھی پسند آئی۔

میری مہذب بننے کی یہ سنک کوئی تین ماہ ہی چلی ہو گی مگر لباس کی خوشنمائی تو عرصہ تک چلتی رہی کیونکہ اب میں طالب علم بن گیا تھا۔

☆☆☆

باب نمبر ۱۲

سادگی کی طرف

کوئی یہ خیال نہ کرے کہ ناچ وغیرہ کے تجربات میرے لا ابالیانہ پن کے زمانہ کے ہیں۔ غور سے دیکھنے پر قارئین کو اس میں سے چند ایک باعث غور و فکر باتیں بھی مل گئی۔ مگر اس سے محبت خیز عہد میں بھی کافی حد تک میں محتاط تھا۔ پائی پائی کا حساب رکھتا۔ خرچ مقرر تھا۔ بس کا کرایہ اور ڈاک خرچ بھی ہمیشہ لکھا کرتا تھا اور سونے سے پہلے ہمیشہ اپنا روزنامہ ملا لیا کرتا تھا۔ یہ عادت آخیر تک قائم رہی اور میں سمجھا ہوں کہ اسی لیے پبلک لائف میں میرے ہاتھوں سے لاکھوں روپے کا الٹ پھیر ہونے سے بھی میں کفایت شعاری سے کام نکال سکا ہوں۔ اور جتنی تحریکیں میری نگرانی میں چلی ہیں ان میں مجھے قرض نہیں لینا پڑا بلکہ ہر ایک میں کچھ نہ کچھ بچت ہی رہی ہے۔

میں نے خرچ نصف کر دینے کا خیال کیا۔ حساب کو غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ گاڑی کے کرایہ کا خرچ زیادہ آتا تھا۔ پھر ایک قبیلہ کے ساتھ رہائش چھوڑ کر الگ کمرہ لے کر رہنے کا فیصلہ کیا اور یہ بھی طے کیا کہ کام کے مطابق اور تجربہ حاصل کرنے کے لیے الگ الگ محلوں میں مکان لینا چاہیے۔ میں نے ایسی جگہ مکان پسند کیا جہاں سے کام والی جگہ ادھ گھنٹہ میں پیدل چل کر پہنچ سکوں اور گاڑی کا کرایہ بچ جائے۔ اس سے قبل ایک تو جانے سے پہلے گاڑی کے کرایہ کا خرچ آتا تھا اور پھر سیر کے لیے الگ وقت نکالنا پڑتا تھا۔ مگر اب کام پر جانے سے سیر کا کام بھی پورا ہونے لگا۔ اس طریقہ سے عمل پذیر رہنے پر آٹھ دس میل تو میں آسانی سے ہی چل پھر لیا کرتا تھا۔ بالخصوص اس ایک عادت کی وجہ سے میں ولایت میں

شاید ہی بیمار پڑا ہوں گا۔ میرا جسم اچھا چست بن گیا۔ خانہ داروں کے ساتھ رہائش کو چھوڑ کر اور کمرے کرایہ پر لئے ایک سونے کے لیے اور دوسرا نشست گاہ لیے۔ یہ دوسرا تبدیل شدہ کام تھا۔ تیسری تبدیلی ابھی بعد کو آئے گی۔

اس طرح نصف خرچ بچ گیا لیکن وقت؟ میں جانتا تھا کہ بیرسٹری کے امتحان کے لیے زیادہ پڑھائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس لیے میں بے فکر تھا۔ مگر میرا انگریزی میں کمزور رہنا مجھے اکھرتا تھا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ بیرسٹر ہونے کی بجائے مجھے کسی اور قسم کا درس بھی لینا چاہیے۔ آکسفورڈ اور کیمبرج کے کورس کا پتہ لگایا اور کئی دوستوں سے ملاقات ہوئی جب یہ پتہ چلا کہ وہاں جانے سے کافی خرچ آئے گا اور درس کا سلسلہ بھی کافی طویل ہے اور میں تین سال سے زیادہ وہاں رہ نہیں سکتا تھا پھر ایک دوست نے بتایا کہ اس طرح محنت کرنی پڑے گی مگر اوسط درجہ کی جانکاری ہو جائے گی لیکن خرچ بالکل زیادہ نہیں آئے گا۔ مجھے یہ مشورہ پسند آیا لیکن امتحان کی فہرست کو دیکھ کر سخت گھبرایا۔ اس میں لیٹن اور ایک دوسری زبان نہیں لازم تھی۔ وکیل کے لیے لیٹن کی سخت ضرورت رہا کرتی ہے لیٹن جاننے والے کے لیے قانونی کتب کی جانکاری سہل ہو جاتی ہے لیکن رومن قانون کے امتحان میں ایک پرچہ تو صرف لیٹن زبان کا ہی ہوتا ہے اور لیٹن جاننے پر انگریزی زبان پر اقتدار غالب آجاتا ہے۔

ان دلائل کا مجھ پر کافی اثر ہوا۔ میں نے یہی فیصلہ کر لیا اور ایک انفرادی طور پر چلنے والی میٹرکولیشن کلاس میں داخل ہو گیا۔ وہاں ہر ششماہی کو امتحان ہوا کرتا تھا۔ میرے پاس بمشکل پانچ ماہ کا وقت تھا اور یہ میری ہمت سے بعید کام تھا۔ لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ کہاں میں مہذب بننے چلا تھا اور کہاں نہایت چست طالب علم بن گیا۔ ٹائم ٹیبل بنایا اور ایک ایک منٹ کی بچت کی لیکن میری عقل اور قوت یادداشت ایسی نہیں تھی کہ دوسرے اسباق کے ساتھ فرنچ اور لیٹن کو بھی سنبھال سکتا۔ امتحان میں بیٹھے ہی لیٹن میں فیل ہو گیا۔ اس سے کافی تکلیف ہوئی لیکن ہمت کو جواب نہ دیا۔ لیٹن میں مزا آنے لگ گیا تھا سوچا فرنچ زیادہ اچھی ہو جائے گی اور سائنس میں نیا مضمون لے لوں گا۔ رسائن شاستر جس میں مجھے اچھی طرح جی لگانا چاہیے۔ تجربات کی کمی کی وجہ سے مجھے اچھا ہی معلوم نہ ہوا۔ دیش میں اگر چہ یہ

مضمون میرے درس میں رہا ہی تھا۔ اس لیے لندن کے میٹرک کے لیے بھی پہلی بار اسی کو پسند کیا۔ اس دفعہ روشنی اور حرارت کو لیا۔ یہ موضوع آسان خیال کیا جاتا تھا۔ اور مجھے بھی آسان ہی معلوم ہوا۔

پھر امتحان دینے کی تیاری کے ساتھ ہی بودوباند میں اور بھی سادگی لانے کی کوشش کی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ابھی میری زندگی میں اتنی سادگی نہیں آئی۔ جو میرے گھرانہ کی غربت کے مناسب ہو۔ بھائی صاحب کی تنگ دستی اور فراخدلی کا خیال آتے ہی مجھے سخت تکلیف ہوتی۔ دس پندرہ پونڈ ماہوار خرچ کرنے والے کو تو وظائف ملتے تھے اور اپنے سے زیادہ سادہ رہنے والوں کو بھی دیکھتا تھا۔ ایسے غریب طالب علم میرے تقرب میں کافی رہا کرتے تھے۔ ایک طالب علم لندن کے غریب محلہ میں دو شلنگ فی ہفتہ دے کر رہتا تھا اور لوکاٹ کی سستی کوکو کی دکان میں دو پینی کوکو اور روٹی کھا کر گزر کیا کرتا تھا۔ اس کا مقابلہ کرنے کی تو مجھے جرأت نہیں تھی۔ لیکن اتنا ضرور سمجھ گیا تھا کہ میں دو کی بجائے ایک کمرہ میں ہی گزارہ کر سکتا ہوں اور آدھی رسوئی ہاتھ سے بھی تیار کر سکتا ہوں۔ اس طرح چار پانچ پونڈ ماہوار خرچ آ سکتا تھا۔ سادگی سے رہائش اختیار کرنے کی مکتب کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ دو کمرے چھوڑ کر آٹھ شلنگ فی ہفتہ پر ایک کمرہ لیا۔ ایک اسٹو خریدا اور صبح کا کھانا ہاتھ سے تیار کرنے لگا۔ بیس منٹ سے زیادہ کھانا تیار کرنے میں صرف نہیں ہوتے تھے جو کا دلیا اور کوکو کے لیے پانی ابلانے میں کتنا وقت خرچ آتا ہے؟ دوپہر کو کہیں باہر کھالیتا اور شام کو پھر کوکو بنا کر روٹی کے ساتھ کھاتا۔ اس طرح ایک یا سوا شلنگ روزانہ خوراک پر خرچ کرنا سیکھ گیا۔ میرا زیادہ سے زیادہ وقت مطالعہ کا تھا۔ سادہ زندگی بسر کرنے سے کافی بچت ہونے لگی اور دوسری بار امتحان میں شریک ہونے پر میں کامیاب ہو گیا۔

قارئین یہ خیال نہ کریں کہ سادگی سے زندگی بے کیف ہو گئی ہوگی بلکہ برعکس اس کے اس تبدیلی سے میری ظاہری اور باطنی حالت ایک جیسی ہو گئی اور گرہستی زندگی کے حالات سے میرا بودوباند کا میل بن گیا اور زندگی کافی حد تک کامیاب ہو گئی اور روحانی مسرور کی حد نہ رہی۔

☆☆☆

باب نمبر۱۴

لالچ سے بچ گیا

جوں جوں میں زندگی کے متعلقات پر گہرا غور کرتا گیا۔ ایسے ہی ظاہری اور باطنی تبدیلی کی ضرور معلوم ہوتی گئی جس کی رفتار سے بودوماند اور اخراجات میں تبدیلی کی گئی۔ اسی انداز سے یا اور بھی تیزی سے کھانے میں تبدیلی کرنی شروع کی ڈالی۔ خوراک کے متعلقہ انگریزی کتب میں نے خریدیں۔ ولایت میں ایسے خیالات رکھنے والوں کی ایک جماعت تھی اس کی طرف سے ایک ہفتہ وار اخبار بھی نکلتا تھا۔ میں اس کا خریدار بن گیا اور جماعت کا ممبر بھی پھر تھوڑے عرصہ میں ہی اس کی مجلس مشاورت میں لے لیا گیا۔ یہاں میری ان لوگوں سے ملاقات ہوئی جو اناج خوروں کے ستون کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا اب میں کھانے کے تجربات میں پڑ گیا۔

گھر سے منگوائی ہوئی مٹھائی اور مصالحہ کا استعمال بند کر دیا خیالات دوسری طرف منعطف ہوگئے اور مصالحوں کا شوق جاتا رہا۔ چاء اور کافی کو بھی چھوڑ دیا بلکہ زیادہ تر میں روٹی، کوکو اور ابلی ہوئی سبزی پر ہی گزارہ کرنے لگا۔ میرے ان تجربات سے مجھے یہ محسوس ہوا کہ ذائقہ دراصل زبان کو نہیں بلکہ من کو آیا کرتا ہے۔

میں نے مختلف مذاہب سے جانکاری کی بھی کوشش کی۔ اسی اثناء میں دو تھیا سوفسٹ دوستوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مجھے گیتا پڑھنے کی تحریک کی۔ یہ دونوں وائیڈون ارنلڈ کے انگریزی میں گیتا کے ترجمہ کا مطالعہ کر رہے تھے۔ مگر انہوں نے مجھے اپنے ہمراہ سنسکرت میں گیتا پڑھنے کے لیے کہا مجھے شرم آ گئی کیونکہ میں نے گیتا سنسکرت میں تو

کیا گجراتی میں بھی نہیں پڑھی تھی۔ مجھے یہ بات انہیں کافی جھجکتے ہوئے کہنی پڑی لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میں آپ کے ساتھ پڑھنے کے لیے تیار ہوں۔ ویسے تو میری سنسکرت سے جانکاری نفی کے برابر ہے مگر اس کے باوجود میں اتنا تو سمجھ لیتا ہوں کہ ترجمہ میں کوئی الجھاؤ ہو تو وہ میں بتا سکتا ہوں۔ اس طرح ان بھائیوں کے ساتھ میرا گیتا کا مطالعہ شروع ہوا۔ دوسرے ادھیائے کے آخر میں ان شلوکوں۔

خواہشات کے گرویدہ کو خواہشات میں ہی کشش حاصل ہوتی ہے اور کشش سے تمنا بیدار ہوتی ہے۔ تمنا سے غصہ ظاہر ہوتا ہے، غصہ سے بے وقوفی غالب آتی ہے اور بے وقوفی سے یادداشت کم ہو جاتی ہے اور یادداشت کے سلب ہو جانے پر آدمی عقل سے عادی ہو کر مردہ بظاہر زندہ رہ جاتا ہے۔

کا نہایت گہرا اثر میرے ذہن پر ہوا اور دن رات کانوں میں یہی آواز گونجتی رہتی تھی۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ بھگوت گیتا تو نہایت قیمتی گرنتھ ہے چنانچہ یہ خیال دن بدن استوار ہوتا چلا گیا مگر اب تو راز حقیقی کے لیے میں اسے سب سے افضل خیال کرتا ہوں۔ مایوسی کے عالم میں اس گرنتھ نے مجھے با کمال مدد فرمائی۔

اسی عرصہ میں ایک ویجیٹیرین بورڈنگ میں مانچسٹر کے ایک عیسائی ہمدرد سے میری ملاقات ہوئی۔ ان کی تحریک سے میں نے بائبل کا مطالعہ کیا لیکن عہد نامہ قدیم تو میں پڑھ ہی نہ سکا۔ وہ مجھے کچھ اچھا ہی نہیں لگا لیکن جب نیا عہد نامہ پڑھا تو عیسیٰ علیہ السلام کے متعارفانہ کلمات کا میرے ذہن پر گہرا اثر ہوا اور اس نے میرے دل پر گھر کر لیا۔ عقل و ادراک نے گیتا کے ساتھ اس کا موازنہ کیا۔ جو تیرا کرتا مانگے تو اسے انگرکھا دے ڈال۔ جو تیرے دائیں رخسار پر تھپڑ رسید کرے اس کے سامنے بایاں رخسار کر دے۔ یہ پڑھ کر مجھے از حد خوشی ہوئی اور شامل بھٹ کا کلام بھی یاد آیا۔

اگرچہ میں نے ہندو دھرم اور دوسرے دھرموں کا بھی معمولی مطالعہ کیا ہے مگر اس کے باوجود فطرات اور مصائب سے بچنے کے لیے یہ کافی نہیں تھا۔

ولائیت کے میرے آخری سال یعنی ۱۸۹۰ء میں پورٹ سمتھ میں ایک سبزی خوروں کی مجلس منعقد ہوئی۔ اس میں مجھے اور ایک اور ہندوستانی کو دعوت ملی تھی۔ ہم دونوں

ایک بہن کے پاس ٹھہرائے گئے تھے۔ جس کی نسبت استقبالیہ کمیٹی کو کوئی علم نہیں تھا کیونکہ وہ ایک بدنام گھر تھا۔

رات کو جب ہم اجلاس سے گھر واپس آئے تو کھانا کھانے کے بعد تاش کھیلنے بیٹھے۔ ولایت کے اچھے گھرانوں میں گھر کی مالکن بھی مہمانوں کے ساتھ تاش کھیلا کرتی ہے۔ تاش کے کھیل کے وقت عام طور پر لوگ ایسے ہی مذاق کیا کرتے ہیں اس لیے یہاں واہیات مخول شروع ہو گیا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ میرے رفیق اس پہلو میں ہوشیار ہیں۔ اس لیے مجھے اس مخول بازی میں لطف آنے لگا۔ آہستہ آہستہ میں بھی ان میں شامل ہو گیا۔ اور مذاق نے زبان کے بعد عمل کی صورت اختیار کرنی شروع کر ڈالی اور تاش کو ایک طرف پھینک دینے کی نوبت آ پہنچی۔ مگر میرے رفیق کے دل میں جس طرح بھگوان آ بیٹھے اور وہ بولے تم اور یہ پاپ؟ یہ تمہارا کام نہیں ہے۔ یہاں سے بھاگو۔

جس طرح میں بیدار ہو گیا اور سخت نادم ہوا اور تہہ دل سے اس دوست کا شکریہ ادا کیا۔ ماں کی تاکید یاد آئی اور وہاں سے بھاگتا ہوا اپنے کمرہ میں پہنچا۔

اس وقت میں دھرم کیا ہے؟ ایشور کیا چیز ہے؟ وہ ہمارے اندر کس طرح کام کرتا ہے؟ ان باتوں کو میں نہیں جانتا تھا مگر عام معنوں میں میں یہی سمجھا کہ بھگوان نے مجھے بچالیا ہے۔ زندگی میں مختلف مواقعہ پر مجھے یہی محسوس ہوا اور سچ پوچھیے تو مجھے یہ کہتے ہوئے از حد مسرت ہوتی ہے کہ مجھے بے شمار تکلیفات کے موقعہ پر بھگوان نے بڑی اچھی طرح بچایا ہے۔ چنانچہ جب چاروں طرف سے امید کے انقطاع کا وقت آ جاتا ہے۔ ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ اس وقت کہیں نہ کہیں امداد غیبی آ پہنچتی ہے۔ استتی' پراتھنا' اپاسنا یہ اندھا اعتقاد نہیں۔ بلکہ اتنی ہی اس سے زیادہ سچی باتیں ہیں۔ جتنا ہمارا کھانا پینا' چلنا' بیٹھنا سچ ہے۔ بلکہ یہ کہنے میں بھی مضائقہ نہیں کہ یہی ایک واحد حقیقت ہے۔ دوسری تمام باتیں باطل اور جھوٹ ہیں۔

☆☆☆

باب نمبر ۱۴

بیرسٹری

اس عرصہ میں میرا درس جاری رہا۔ نو ماہ کی انتھک محنت کے بعد ۱۰ جون ۱۸۹۱ء کو میں بیرسٹر بن گیا اور ۱۲/ جون کو ہندوستان واپس آنے کے لیے روانہ ہوا لیکن میری مایوسی کی کوئی حد نہ رہی میں نے قانون کا مطالعہ تو کر لیا لیکن میرا جی کہتا تھا کہ ابھی تک قانون کی ایسی جانکاری نہیں ہو پائی کہ وکالت کر سکوں۔

جون جولائی میں بحرِ ہند میں طوفان رہتا ہے۔ عدن سے ہی سمندر کی ایسی کیفیت تھی۔ تمام لوگ بیمار ہو گئے۔ اکیلا میں ہی مزے میں تھا اور طوفان دیکھنے کے لیے ڈیک پر جایا کرتا تھا لیکن بھیگ بھی جاتا تھا۔ صبح ناشتہ کے وقت مسافروں سے ایک دو آدمی ہی میز پر نظر آیا کرتے تھے۔ ہمیں جو کے دلیہ کی رکابی گود میں رکھ کر کھانی پڑتی تھی۔ طوفان کی وجہ سے جہاز اس قدر ہلتا تھا کہ دلیا گود میں ہی لڑھک پڑتا تھا۔

یہ بیرونی طوفان میرے باطنی طوفان کا محض نشان ہی تھا لیکن اس طوفان میں میں نے جس طرح اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہی بات اس کے برعکس کیفیت کی بھی تھی۔

جب ہم بندرگاہ پر پہنچے۔ میرے بڑے بھائی وہاں موجود تھے۔ ماتا جی کے پرلوک سدھارنے کی خبر سے میں بالکل محروم تھا۔ گھر پہنچنے پر مجھے یہ خبر سنائی گئی۔ اگرچہ یہ خبر مجھے ولایت میں دی جا سکتی تھی لیکن میرے بھائی نے میرے بمبئی وارد ہونے تک یہ خبر نہ دینے کا ہی فیصلہ کیا ہوا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ میرے دل پر کم سے کم چوٹ پہنچے۔ میرے کئی

خیال مٹی میں مل گئے لیکن مجھے یاد ہے کہ اس خبر کو سن کر مجھے رونا نہیں آیا۔ آنسو بھی نہیں گرائے اور اس طرح کام کاج جاری رکھا جس طرح ماتا جی کی موت ہوئی ہی نہیں۔

تھوڑے عرصہ تک میں راج کوٹ میں ہی رہا لیکن دوستوں نے یہ مشورہ دیا کہ میں چند دن کے لیے بمبئی جا کر ہائی کورٹ کا خاص تجربہ حاصل کروں اور ہندوستانی قانون کا مطالعہ کروں اور ساتھ ہی ہو سکے تو وکالت کرنے کی بھی کوشش کروں۔ میں بمبئی گیا مگر وہاں چار پانچ ماہ سے زاید نہ ٹھہر سکا کیونکہ خرچ بڑھتا جاتا تھا اور آمدن تھی ہی نہیں اس لیے بمبئی سے مایوس ہو کر راج کوٹ آیا۔ الگ دفتر کھولا' کچھ سلسلہ چلا اور عرضیاں لکھنے کا کام ملنے لگا۔

تین سو روپیہ ماہوار کے لگ بھگ آمدن ہونے لگی۔ یہ عرضیاں مجھے اپنی قابلیت نہیں بلکہ ایک ذریعہ سے ملا کرتی تھیں۔ بڑے بھائی کے ساتھی وکیل کی وکالت اچھی چلتی تھی۔ اگر جو بڑی ضروری اور اہم عرضیاں آیا کرتیں اور جن کو وہ زیادہ اہمیت دیا کرتے تھے وہ بیرسٹر کے پاس جاتیں مجھے تو صرف ان کے غریب موکلوں کی عرضیاں ہی ملا کرتی تھیں۔

☆☆☆

باب نمبر ۱۵

جنوبی افریقہ

اسی دوران میں مجھے کاٹھیاواڑ کے اندرونی جھگڑوں کا بھی کچھ تجربہ ہو گیا۔ جس سے میرا جی اکتا گیا۔

اس وقت بھائی صاحب کے پاس پور بندر کی دادا عبداللہ اینڈ کمپنی نامی ایک میمن فرم کا پیغام آیا کہ ہمارا جنوبی افریقہ میں کافی کاروبار ہے طیب حاجی خان محمد کے خلاف ہمارے چالیس ہزار پونڈ کا ایک مقدمہ کافی عرصہ سے چل رہا ہے۔ اگر آپ اپنے بھائی کو وہاں بھیج دیں تو ہمیں بھی مدد ملے گی اور ان کی بھی کچھ مدد ہو جائے گی۔

اس دوکان..... ایک حصہ دار نے اگر میں ایک سال کام کرتا رہوں تو آمد و رفت کا اوّل درجہ کا کرایہ اور خوراک کے خرچ کے علاوہ ۱۰۵ پونڈ دینے کا وعدہ کیا۔ میں راضی ہو گیا اور اپریل ۱۸۹۳ء میں ہندوستان سے جنوبی افریقہ کے لیے روانہ ہو گیا۔

نیٹال کا بندر ویسے تو ڈربن کہلاتا ہے۔ لیکن نیٹال کو بھی بندری کہتے ہیں۔ مجھے بندر پر لینے کے لیے خود عبداللہ سیٹھ آئے تھے۔ نیٹال کے جو لوگ جہاز پر اپنے دوستوں کو لینے آئے تھے۔ ان کے رنگ ڈھنگ سے میں سمجھ گیا کہ یہاں ہندوستانیوں کی کوئی توقیر نہیں ہے۔ عبداللہ سیٹھ کے جانکار لوگ ان کے ساتھ جس طرح کا سلوک کیا کرتے تھے اس میں ایک طرح کی ہتک نظر آتی تھی۔ جس سے میرے دل کو چوٹ لگتی تھی لیکن عبداللہ سیٹھ تو اس بے عزتی کے عادی ہو چکے تھے۔ جو بھی میری طرف دیکھتا وہ حیران رہ جاتا۔ کیونکہ میرا لباس اس قسم کا تھا جس کی وجہ سے میں دوسرے ہندوستانیوں سے کافی الگ نظر آتا تھا۔ اس

وقت میں نے فراک کوٹ پہنا ہوا تھا اور سر پر بنگالی طرز کی پگڑی تھی۔

گھر پہنچا تو مجھے عبداللہ سیٹھ کے کمرہ کے ساتھ کا کمرہ دیا گیا۔ ابھی اچھی طرح جان پہچان بھی نہیں ہوئی تھی مگر جب اپنے بھائی کی دی ہوئی چٹھی کو انہوں نے پڑھا تو وہ قدرے خصمہ میں پڑ گئے۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ بھائی نے تو یہ سفید ہاتھی گھر پر باندھ دیا ہے۔ میرا انگریزی انداز انہیں بڑا خرچیلا نظر آیا کیونکہ میرے لیے ان کے پاس اس وقت تو کوئی کام نہیں تھا۔ مقدمہ ٹرانسوال میں چل رہا تھا۔ فوراً ہی مجھے وہاں بھیج کر کیا کرتے ہیں؟ اور اس کے علاوہ ایک اور بھی سوال تھا کہ میری قابلیت اور ایمانداری کا بھی کہاں تک اعتماد کیا جائے اور پرٹوریا میں وہ خود میرے ساتھ رہ نہیں سکتے تھے۔ مخالف فریق پرٹوریا میں رہتے تھے۔ اگر کہیں میں ان سے متاثر ہو جاؤں تو پھر؟ اور دوسرے کام بھی ان کے کارکن مجھ سے زیادہ بہتر کر سکتے تھے اور پھر کارکن سے اگر کہیں کوئی غلطی وغیرہ ہو جائے تو اسے تنبیہ بھی کی جا سکتی ہے مگر مجھے کچھ کہنے سے بھی رہے۔ وہاں یا تو کلرک کا کام تھا یا مقدمے کا...... اور کوئی کام نہیں تھا۔ اس حالت میں اگر مقدمے کا کام میرے سپرد نہیں کر سکتے تو گھر پر بٹھا کر میرا خرچ برداشت کرنا پڑتا تھا۔

عبداللہ سیٹھ پڑھے لکھے کم ہی تھے لیکن تجربہ کافی تھا۔ بڑے تیز فہم تھے اور وہ خود بھی اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے۔ انگریزی زبان میں بات چیت کر لیا کرتے تھے۔ بنک میں منیجر سے باتیں بھی کیا کرتے تھے۔ یوروپین بیوپاریوں سے سودا کر لیا کرتے تھے اور وکیلوں کو اپنا معاملہ سمجھا سکتے تھے۔ ہندوستانیوں میں ان کی کافی عزت تھی۔ ان کی دکان اس زمانہ میں تمام ہندوستانیوں سے بڑی نہیں مگر بڑی دکانوں میں سے ضرور تھی۔

دوسرے یا تیسرے دن وہ مجھے ڈربن کی کورٹ دکھانے لے گئے۔ وہ کئی لوگوں سے جانکاری کرائی۔ عدالت میں اپنے وکیل کے پاس مجھے بٹھایا۔ مجسٹریٹ میری طرف دیکھتا رہا اور بولا:

''اپنی پگڑی اتار لو۔''

مگر میں نے انکار کیا اور عدالت سے باہر چلا گیا۔

میری قسمت میں یہاں لڑائی ہی لکھی تھی۔

پگڑی اتارنے کا راز مجھے عبداللہ سیٹھ نے بتایا۔ اسلامی لباس پہننے والا اپنی اسلامی پگڑی یہاں پہن سکتا ہے مگر ہندوستانیوں کو عدالت میں جاتے ہوئے اپنی پگڑی اتار لینی چاہیے۔

ایسی حالت میں پگڑی استعمال کرنے کا سوال مشکل ہو گیا۔ پگڑی اتار دینے کا مطلب تھا بے عزتی برداشت کرنی۔ چنانچہ میں نے یہ ترکیب نکالی کہ ہندوستانی پگڑی کی بجائے انگریزی ٹوپی استعمال کی جائے۔ جس سے اس کے اتارنے میں بے عزتی کا احتمال بھی نہ رہے اور میں اس جھگڑے سے بھی بچ جاؤں۔

لیکن سیٹھ عبداللہ کو یہ بات پسند نہ آئی۔ انہوں نے کہا ''اگر آپ اس وقت ایسا کریں گے تو اس کے الٹے معنی لیے جائیں گے جو لوگ دیسی پگڑی پہننے کو پسند کرتے ہیں۔ ان کی کیفیت تعجب خیز ہو جائے گی اور اس کے علاوہ آپ کو اپنے سر پر اپنے ملک کی پگڑی ہی زیب دیتی ہے۔ اگر آپ انگریزی ٹوپی کا استعمال کریں گے تو لوگ ''ویٹر'' خیال کریں گے۔

ان الفاظ میں عمومیت پائی جاتی تھی۔ ملکی تفخر اور قدرے جھجک بھی پائی جاتی تھی لیکن غور و فکر کے بعد مجھے عبداللہ سیٹھ کی بات اچھی معلوم ہوئی۔ میں نے پگڑی والے واقعہ پر اخبارات میں آرٹیکل لکھے اور پگڑی کے خیالات کی حمایت کی۔ اخباروں میں خوب بحث چلی۔ بنا بلائے مہمان کے نام سے میرا نام اخباروں میں آ گیا۔ تین چار دن کے اندر اندر اچانک ہی جنوبی افریقہ میں میری شہرت ہو گئی۔ کسی نے میرے دلائل کی تائید کی اور کسی نے میری خودسری کی مذمت کی۔

عبداللہ سیٹھ کو میرے لیے کام کی تلاش میں زیادہ دقت پیش نہ آئی ان کے مقدمہ کے لیے میرا پرٹوریا میں رہنا لازمی تھا۔

ساتویں یا آٹھویں دن میں ڈربن سے روانہ ہوا۔ میرے لیے پہلے درجہ کا ٹکٹ لیا گیا۔ سونے کے لیے وہاں پانچ شلنگ کا علیحدہ ٹکٹ لینا پڑتا تھا۔ عبداللہ سیٹھ نے تاکیدی لہجہ میں کہا کہ سونے کا ٹکٹ لے لو لیکن میں نے کچھ تو ضد سے یا قدرے خوشی میں اور کچھ پیسے بچانے کے لیے لالچ سے انکار کر دیا۔

عبداللہ سیٹھ نے مجھے محتاط کیا۔ دیکھو یہ ملک اور ہے۔ ہندوستان نہیں۔ خدا کی

مہربانی ہے۔ آپ پیسے کا خیال نہ کریں اپنے آرام کا مکمل انتظام کر لینا چاہیے۔

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ میرا فکر مت کریں۔

نٹال کے دارالحکومت میرنسبرگ میں رات کے نو بجے کے لگ بھگ ٹرین پہنچی۔ یہاں سونے والوں کو بستر دیئے جاتے تھے۔ ریلوے کے نوکروں نے آ کر پوچھا:

"آپ بستر چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا "میرے پاس بستر ہے۔"

وہ چلا گیا۔ اسی دوران میں ایک مسافر آیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور مجھے ہندوستانی سمجھ کر وہ چکرایا۔ باہر چلا گیا اور ایک دو ملازمین کو ساتھ لے آیا۔ مگر کسی نے بھی مجھے کچھ نہ کہا۔ آخرکار ایک افسر آیا اور بولا:

"اتر جاؤ تم کو دوسرے ڈبے میں جانا ہوگا۔"

میں نے کہا "لیکن میرے پاس تو پہلے درجہ کا ٹکٹ ہے۔"

اس نے جواب دیا "کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں کہتا ہوں کہ تمہیں آخری ڈبہ میں بیٹھنا ہوگا۔"

"میں کہتا ہوں کہ ڈربن سے اسی ڈبہ میں بٹھایا گیا ہوں اور اسی میں جانا چاہتا ہوں۔"

افسر بولا "ایسا نہیں ہو سکتا۔ تمہیں اترنا ہی پڑے گا نہیں تو سپاہی آ کر اتار دے گا۔"

میں نے کہا "یہ تو درست ہے۔ سپاہی آ کر بھلے ہی مجھے اتارے میں خود بخود نہیں اتروں گا۔"

چنانچہ سپاہی آ گیا۔ اس نے ہاتھ سے پکڑ لیا اور دھکا دے کر مجھے نیچے گرا دیا۔ میرا سامان نیچے اتار لیا گیا۔ میں نے دوسرے ڈبہ میں جانے سے انکار کر دیا۔ گاڑی چلی گئی اور میں ویٹنگ روم میں آ کر بیٹھ گیا۔ ہینڈ بیگ اپنے ہاتھ میں رکھا۔ دوسرے سامان کو میں نے ہاتھ نہ لگایا۔ ریل والوں نے سامان کہیں رکھوا دیا۔ سردی کا موسم تھا۔ جنوبی افریقہ میں بلند مقامات پر سخت کڑاکے کی سردی پڑتی ہے۔ میرنسبرگ بلندی پر واقع تھا۔ اس لیے خوب سردی لگی۔ میرا اوورکوٹ میرے سامان میں رہ گیا تھا مگر سامان مانگنے کی ہمت نہ پڑی تاکہ کہیں پھر بے عزتی نہ ہو جائے۔ سردی سے سکڑتا اور ٹھٹھرتا رہا۔ کمرے میں روشنی نہیں تھی۔

آدھی رات کے وقت ایک مسافر آیا ایسے معلوم ہوا جس طرح وہ کچھ بات کرنا چاہتا ہو لیکن میرے آلہ خیال کی حالت ایسی نہیں تھی کہ میں باتیں کرتا۔

میں سوچنے لگا۔ میرا کیا فرض ہے؟ مجھے اپنے حقوق کے لیے جھگڑنا چاہیے یا ایسے ہی واپس چلے جانا چاہیے؟ یا جو بے عزتی ہو رہی ہے اسے برداشت کر کے پرٹوریا پہنچ جاؤں اور مقدمے کا کام ختم کر کے وطن چلا جاؤں مقدمے کو ادھورا چھوڑ کر بھاگ جانا تو بزدلی ہوگی اور جو کچھ مجھ پر گزری ہے وہ تو رنگت کے حاسدانہ عناد کا ظاہراً نمونہ ہے۔ اگر اس سخت جان بیماری کو دور کرنے کی ہمت اپنے پاس ہو تو اس کو استعمال میں لانا چاہیے اس کام کے لیے جتنی تکلیف اور مصیبت برداشت کرنی پڑے۔ برداشت کرنی چاہیے اور ان بے انصافیوں کی اس حد تک مخالفت کرنی چاہیے جس حد تک اس کا رنگت سے نفرت کا تعلق ہو۔

اس ارادہ سے کہ جس طرح بھی ہو سکے دوسری ٹرین سے آگے جانے کا فیصلہ کر لیا۔

صبح کو میں نے جنرل مینجر کو تار کے ذریعہ ایک طویل شکایت لکھ بھیجی اور دادا عبداللہ کو بھی خبر بھیجی۔ عبداللہ سیٹھ نے فوراً جنرل مینجر سے مل کر اپنے آدمیوں کی حمایت کی اور کہا کہ میں نے سٹیشن ماسٹر صاحب کو لکھ دیا ہے کہ گاندھی جی کو خیریت سے اپنی جگہ پر پہنچا دو۔ عبداللہ سیٹھ نے میرنسبرگ کے ہندوستانی بیوپاریوں کو بھی مجھے ملنے اور میرا انتظام کرنے کے لیے تار دیا تھا۔ دوسرے سٹیشن پر ایسے ہی تار دے دیئے جس سے بیوپاری لوگ سٹیشن پر مجھے ملنے آئے۔ انہوں نے اپنے خلاف ہونے والی بے انصافیوں کا میرے سامنے ذکر کیا اور کہا کہ آپ پر جو کچھ گزری ہے وہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ پہلے اور دوسرے درجہ میں ہندوستانی لوگ سفر کر رہے ہیں۔ انہیں ریل کے افسر اور کیا مسافر دونوں ستاتے ہیں۔ سارا دن انہیں باتوں کے سننے میں گزر گیا۔

رات ہوئی گاڑی آئی۔ میرے لیے جگہ تیار تھی۔ ڈربن میں سونے کے لیے جس ٹکٹ کو لینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہی میرنسبرگ میں لیا۔ ٹرین مجھے چارلس ٹاؤن لے کر چلی۔ آگے چل کر مجھے گھوڑا گاڑی میں تو اور بھی تکلیفات کا سامنا کرنا پڑا۔ آخرکار جوہانسبرگ پہنچا اور وہاں سے پھر ریل کے ذریعہ پرٹوریا گیا۔

باب نمبر ۱۶

خدمت گاری کی ابتداء

۱۸۹۳ء میں جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کی حالت کا مجھے پورا پورا علم ہو گیا تھا لیکن پرٹوریا میں ہندوستانیوں سے اس معاملہ میں کبھی کبھی بات چیت کر لینے کے علاوہ میں نے اب تک بظاہر کوئی کام نہیں کیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک طرف مقدمہ کی کارروائی اور دوسری طرف جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے مصائب کو دور کرنے کی کوشش دونوں باتیں ایک ساتھ نہیں کی جا سکتیں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ دونوں کام مل کر کرنے سے دونوں کاموں کو نقصان پہنچے گا۔ یہ ۱۸۹۹ء کی بات ہے۔ جس مقدمہ کے لیے میں جنوبی افریقہ آیا تھا وہ اچھی طرح طے ہو گیا۔ اس لیے میں ڈربن واپس آ گیا اور وہاں سے ہندوستان جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اب مجھے دادا عبداللہ کے ہاں سے وداعی دی جا رہی تھی۔ اسی وقت کسی نے نیٹال مرکری نامی اخبار کی ایک کاپی لا کر دی اس میں نیٹال لیجسلیٹو اسمبلی کی کارروائی کی مختصر رپورٹ تھی۔ جس میں کچھ تاریں انڈین فرنچائز کے سلسلہ کی تھیں۔ نیٹال گورنمنٹ ایک ایسا بل پیش کرنا چاہتی تھی جس سے ہندوستانیوں کے حقوق چھنتے تھے۔ ویسے ہی انہیں بہت کم حقوق حاصل تھے مگر اس کے باوجود جو کچھ بھی تھا انہیں چھین لینے کی یہ ابتدا تھی۔ یہ دیکھ کر میں نے اپنا ہندوستان کا سفر ملتوی کر دیا اسی رات کو بیٹھ کر میں نے لیجسلیٹو اسمبلی میں پیش کرنے کے لیے ایک درخواست تیار کی اور حکومت سے بھی تار کے ذریعہ درخواست کی کہ وہ اسمبلی کی کارروائی جلد شروع نہ کرے۔ لہٰذا فوراً سیٹھ عبداللہ کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی گئی اور ان کے نام سے ہی یہ تار بھیج دیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو دن کے لیے بل کی

کارروائی روک دی گئی۔ جنوبی افریقہ کی قانون ساز انجمن کو ہندوستانیوں کی طرف سے اس طرح درخواست کرنے کا یہ پہلا ہی موقعہ تھا۔ اس کا کچھ اثر تو ضرور ہوا لیکن بل کا پاس ہونا ان سے رک نہ سکا۔ اس قسم کی تحریک کا جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ جس سے ساری جماعت میں ایک طرح سے نیا جوش پیدا ہو گیا تھا۔ روزانہ جلسے ہوتے اور لوگ کافی تعداد میں آیا کرتے تھے۔ ضرورت سے زیادہ روپیہ بھی اکٹھا ہو گیا۔ کتنے ہی لوگ اپنی مرضی سے بلا معاوضہ کام کے لیے تیار ہو گئے۔ وہ لکھنے کا کام کرتے۔ گھوم پھر کر لوگوں سے دستخط کراتے اور اس کے علاوہ اور بھی کئی کام کرتے تھے۔ ایسے لوگ بھی تھے جو خود بھی کام کرتے تھے اور روپیہ بھی دیتے تھے۔ پرانے گرمیٹا قلیوں کی اولاد سے جو لوگ وہاں تھے انہوں نے بڑی ہوشیاری سے اس تحریک میں مدد دی۔ وہ انگریزی جانتے تھے اور خوبصورت حرف لکھتے تھے انہوں نے دن رات نقلیں کرنے کا اور دوسرا کام بڑے جوش سے کیا۔ ایک ماہ کے اندر اندر ہی لارڈ رپن کے نام جو اس وقت وزیر نو آبادیات تھے۔ دس ہزار دستخطوں سے ایک درخواست روانہ کر دی گئی اس طرح سے میرے سامنے کا فوری کام تو پورا ہو گیا۔

اس وقت میں نے پھر ہندوستان جانے کی اجازت چاہی لیکن ہماری تحریک میں ہندوستانیوں کی اتنی گہری دلچسپی ہو گئی تھی کہ انہوں نے مجھے نہ جانے کی تاکید کی۔ انہوں نے کہا ”خود آپ نے ہی تو ہمیں یہ بتایا کہ یہ تو سرکار کا پہلا قدم ہے۔ اگر اسے روکا نہ گیا تو آخر کار ہماری ہستی ہی مٹ جائے گی۔ کون جانے نو آبادیات کے وزیر ہماری درخواست کا کیا جواب دیں گے؟ مگر ہمارے حوصلہ کو تو آپ نے دیکھ ہی لیا ہے ہم کام کرنے اور روپیہ خرچ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ مگر راستہ بتانے والوں کے بغیر یہ سب کیا کرایا ہو پٹ جو پائے گا۔

اس لیے ہمارا تو یہی خیال ہے کہ اس وقت آپ کا یہ فرض ہے کہ آپ یہاں ٹھہریں۔ ان کی یہ دلیل مجھے جاندار معلوم ہوئی کہ ہندوستانیوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے کوئی ایک پائیدار تنظیم کی جائے تو بہتر ہوگا۔ اس لیے میں پھر ٹھہر گیا اور اس طرح مئی ۱۸۹۴ء کے لگ بھگ نیٹال انڈین کانگرس کا ظہور ہوا اور ایشور نے میری جنوبی افریقہ کی زندگی کی بنیاد ڈالی اور ہندوستانیوں کی خودداری کی لڑائی کا بیج بو دیا گیا۔

یہاں کے کام کی تاریخ کو جاننے کے لیے قارئین کو جنوبی افریقہ کا ستیہ آگرہ پڑھنے کی سفارش کرتا ہوں۔ اس سے پتہ چلے گا کہ ہمیں کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ سرکاری افسر نے کس کس ڈھنگ سے کانگرس پر حملے کیے اور وہ ان سے کس طرح بال بال بچ گئی۔ لیکن ایک بات کا تذکرہ یہاں ضرور کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ تنقید کرنے کی وجہ سے ہندوستانی سماج کو پوری طرح بچانے کی کوشش کی گئی اور انہیں خود اپنے اپنے نقائص کی طرف متوجہ کرنے کی بھی پوری پوری کوشش کی گئی۔ یورپین لوگوں کے دلائل میں جو بات اچھی اور مناسب معلوم پڑتی اس کی قدر کی جاتی تھی۔ کئی ایسے موقعے بھی آ گئے تھے جن میں یوروپین لوگوں کے ساتھ برابری کی وجہ سے انہیں عزت سے مدد کا موقعہ ملتا تھا اور سچے دل سے ایسا کیا جاتا تھا اور ہماری تحریک کی تمام خبریں اخباروں کو روانہ کی جاتیں اور جب کبھی اخباروں میں ہندوستانیوں پر حملہ کیا جاتا تو ان اخباروں کو ان کے جواب بھی بھیجے جاتے تھے۔

☆☆☆

باب نمبر ۱۷

طوفان کے آثار

جنوبی افریقہ میں رہتے ہوئے اب مجھے تین سال ہو گئے تھے اور لوگ مجھے جان گئے تھے۔ میری وکالت معمولی طور پر اچھی جم گئی تھی۔ اور میں سمجھنے لگ گیا تھا کہ لوگوں کو وہاں میری ضرورت ہے۔ اس لیے میں نے ارادہ کیا کہ گھر جا کر اپنے پریوار کو لے آؤں اور یہاں اقامت گزیں ہو جاؤں اس لیے ۱۸۹۶ء میں' میں وہاں سے رخصت ہوا۔ چھ ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ نیٹال سے مجھے کیبل ملا کہ فوراً چلے آؤ۔ اس لیے میں پھر جلد ہی واپس چلا گیا۔ دادا عبداللہ نے اس وقت "کرولینڈ" نامی سٹیمر خریدا تھا۔ انہوں نے مجھے تاکید کی کہ میں اسی جہاز سے اپنے قبیلہ سمیت کرایہ ادا کیے بغیر ہی سفر اختیار کر دوں۔

میں نے ان کی خواہش کا نہایت اچھی طرح سے استقبال کیا اور آغاز ستمبر میں بمبئی سے دوبارہ نیٹال کے لیے جہاز پر سوار ہو گیا اس بار میرے ساتھ میری پتنی اور دو بیٹے بھی تھے۔ دوسرا اسٹیمر نادری بھی انہیں ایام میں ڈربن کے لیے روانہ ہوا۔ دونوں جہازوں میں کل ملا کر آٹھ صد مسافر ہوں گے۔ جن میں سے آدھے ٹرانسوال جانے والے تھے۔ جہاز دوسری بندرگاہوں پر ٹھہرے بغیر نیٹال پہنچنے والا تھا۔ اس لیے صرف اٹھارہ دن کا سفر تھا۔ جس طرح نیٹال میں ہمارے پہنچتے ہی ہونے والی کسی طوفان کی خبر دینے کے لیے تین چار دن پہلے ہی سمندر میں کافی جوار اٹھا۔ جنوبی افریقہ میں دسمبر کا مہینہ گرمی اور برسات کا موسم ہوا کرتا ہے۔ اس لیے جنوبی سمندر میں ان دنوں کافی طوفان آیا کرتے ہیں۔ طوفان اتنے زور کا تھا اور اتنے دنوں تک رہا کہ مسافر گھبرا گئے۔

یہ ایک قدرتی نظارہ تھا۔ مصیبت میں سب ایک ہو گئے۔ سارے بھید بھاؤ بھول گئے۔ ایشور کو سچے دل سے یاد کرنے لگ گئے۔ ہندو مسلمانوں نے مل کر بھگوان کو یاد کرنا شروع کیا۔ کئی لوگوں نے منتیں مانیں۔ کپتان بھی مسافروں کو ڈھارس بندھانے لگا کہ اگرچہ طوفان زوردار ہے مگر اس کے باوجود کہ اس سے بھی بڑے طوفان میں نے دیکھے ہیں۔ اگر جہاز اچھا ہو تو فی الفور ڈوبتا نہیں ہے۔ اس نے اس ڈھنگ سے مسافروں کو کافی سمجھایا۔ مگر اس کے باوجود ان کی کسی طرح تسلی نہیں ہوتی تھی جہاز میں ایسی آوازیں آئیں جس طرح جہاز ابھی کہیں نہ کہیں سے پھٹنے کو ہے اور کہیں چھید ہونے والا ہے۔ اس کے علاوہ جہاز اتنا ڈگمگاتا کہ جس سے اس کے الٹ جانے کا ڈر لگتا تھا۔ ڈیک پر تو کھڑا ہونا ہی مشکل تھا۔ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات کسی کی زبان پر نہیں تھی۔

مجھے جہاں تک یاد ہے ایسے فکر میں چوبیس گھنٹے گزرے ہوں گے آخرکار مصیبت ٹل گئی۔ مطلع صاف ہو گیا۔ کپتان نے کہا ''اب طوفان چلا گیا۔''

لوگوں کے ذہن سے فکر دور ہوا اور اس کے ساتھ ہی ایشور کا خیال بھی رفو چکر ہو گیا۔ موت کا خوف دور ہوتے ہی جہاز پر راگ رنگ اور عیش و طرب شروع ہو گیا۔ پھر وہی دنیائے دوں کی دلکشی تھی۔ اب بھی نماز پڑھی جاتی، بھجن ہوتے لیکن طوفان کے واقعہ پر اس میں جو سچی عقیدت پائی جاتی تھی وہ نہیں تھی۔

لیکن اس طوفان کی وجہ سے میں مسافروں سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ مجھے طوفان کا خوف نہیں تھا یا بہت کم تھا۔ عموماً اسی طرح کے طوفان میں پہلے دیکھ چکا تھا۔ جہاز میں میرا جی نہیں متلایا، چکر بھی نہیں آتے تھے۔ اس لیے میں لوگوں میں نڈر ہو کر چل پھر سکتا تھا۔ انہیں تسلی دے سکتا تھا اور کپتان کے پیغام ان تک پہنچا سکتا تھا۔ اس محبت کی گرہ نے مجھے بڑا فائدہ پہنچایا۔ ہمارے جہاز نے ۱۸ یا ۱۹ دسمبر کو ڈربن کی بندرگاہ پر لنگر ڈالا اور نادری بھی اسی دن پہنچ گیا لیکن حقیقی طوفان کا تجربہ ہونا تو ابھی باقی ہی تھا۔

☆☆☆

باب نمبر ۱۸

کسوٹی

جنوبی افریقہ کی بندرگاہوں پر مسافروں کا طبی معائنہ ہوتا ہے۔ اگرچہ کسی کو کوئی وبائی مرض ہو جائے تو جہاز کو کوارنٹین میں رکھا جاتا ہے۔ ہم جب بمبئی سے چلے تھے تب وہاں پلیگ پھیل رہا تھا۔ اس لیے ہمیں کوارنٹین کا کچھ خوف تو ضرور تھا۔ بندرگاہ میں لنگر انداز ہونے کے بعد سب سے قبل جہاز پر زرد جھنڈا لہراتا ہے۔ ڈاکٹری معائنہ کے بعد جب چھٹی ملتی ہے تو زرد جھنڈا اتار دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد مسافروں کے رشتہ داروں کو جہاز پر آنے کی اجازت ملتی ہے۔

اسی ڈھنگ سے ہمارے جہاز پر بھی زرد جھنڈا بلند کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر آئے۔ جانچ کر کے پانچ دن کے لیے کوارنٹین کا حکم ہوا۔ کیونکہ ان کا یہ خیال تھا کہ پلیگ کے جراثیم ۲۳ دن تک زندہ رہتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے یہ طے کیا کہ بمبئی سے روانہ ہونے کے ۲۳ دن تک مسافروں کو کوارنٹین کی حالت میں ہی رکھنا چاہیے۔

لیکن اس حکم کی دلیل صرف صحت کے جواز سے نہیں تھی۔ ڈربن کے گورے لوگ ہمیں واپس ہندوستان چلے جانے کی تحریک کر رہے تھے۔ اس حکم میں یہ بات بھی مزید ارتھی۔

دادا عبداللہ کی طرف سے ہمیں شہر کی اس ہلچل کی خبریں مل جایا کرتی تھیں۔ گوروں کی بڑی بڑی مجلسیں ہوا کرتی تھیں۔ دادا عبداللہ کو دھمکیاں دی جاتی تھیں اور انہیں لالچ دیا جاتا تھا۔ اگر دادا عبداللہ دونوں جہازوں کو واپس کر دیں تو انہیں سارا ہرجانہ دینے کے لیے بھی وہ تیار تھے مگر دادا عبداللہ ان دھمکیوں سے ڈرنے والا نہیں تھا۔ اس وقت وہاں

سیٹھ عبدالکریم حاجی آدم دکان پر تھے۔ انہوں نے مصمم ارادہ کیا ہوا تھا کہ خواہ کتنا بھی نقصان ہو جائے میں جہاز کو بندرگاہ پر لا کر مسافروں کو اتروا کر چھوڑوں گا۔ وہ ہمیشہ مجھے تفصیل سے خط لکھا کرتے تھے۔ خوش قسمتی سے اس بار مرحوم من سکھ لال ہیرالال ناظر مجھے ملنے کے لیے ڈربن پہنچے تھے۔ وہ بڑے ہوشیار اور جواں مرد آدمی تھے۔ انہوں نے لوگوں کو اترنے کا مشورہ دیا۔ ان کے وکیل مسٹر لائن تھے۔ وہ بھی ان کی طرح ہی بہادر آدمی تھے۔ انہوں نے گوروں کے کام کی خوب مذمت کی اور لوگوں کو جو مشورہ دیا وہ صرف وکیل کی حیثیت سے فیس لینے کے لیے نہیں تھا۔ بلکہ ایک سچے دوست کی طرح تھا۔

گورے لوگوں کی اس تحریک کا نشانہ درحقیقت میں ہی تھا اور مجھ پر دو الزام تھے۔

۱۔ ہندوستان میں جا کر میں نے نیٹال کے گورے لوگوں کی خوب مذمت کی ہے اور

۲۔ میں نیٹال کو ہندوستانیوں سے بھر دینا چاہتا ہوں۔ اس لیے کرلینڈ اور نادری میں خصوصاً نیٹال میں آباد کرنے کی غرض سے ہندوستانیوں کو بھر لایا ہوں۔

مجھے اپنی ذمہ داری کا بڑا خیال تھا۔ میری وجہ سے دادا عبداللہ نے بڑا بار اپنے سر لیا ہوا تھا۔ مسافروں کی جان بھی مصیبت میں تھی۔ میں نے اپنے بال بچوں کو ساتھ لے کر انہیں بھی مصیبت میں ڈال دیا تھا۔ مگر اس کے باوجود میں ہر پہلو سے بری الذمہ تھا کیونکہ میں نے کسی شخص کو بھی نیٹال جانے کے لیے لالچ نہیں دیا تھا۔

آخر کار تیسویں دن یعنی ۱۳ جنوری کو جہاز کو اجازت ملی اور مسافروں کے اترنے جانے کا حکم اشاعت پذیر ہوا۔ جہاز بندرگاہ پر پہنچا۔ مسافر اترے لیکن میرے لیے جنوبی افریقہ کی حکومت کے ایک ممبر مسٹر اسکمب نے کپتان سے کہہ دیا تھا کہ گاندھی اور اس کے بال بچوں کو شام کو اتاریں۔ گورے ان کے خلاف جوش میں ہیں اور ان کی جان خطرہ میں ہے۔ ڈھکے کے سپرنٹنڈنٹ مسٹر ٹیم انہیں شام کو آ کر لے جائیں گے۔

کپتان نے مجھے یہ پیغام سنایا۔ میں نے اسی مشورہ کے مطابق شام کو اترنا منظور کر لیا لیکن اس پیغام کو ملے ابھی آدھ گھنٹہ بھی نہیں ہوا ہوگا کہ مسٹر لاٹن آئے اور کپتان سے مل کر کہا۔ اگر مسٹر گاندھی میرے ہمراہ آنا چاہیں تو میں اپنی ذمہ داری پر لے جانا چاہتا ہوں۔ جہاز کے ایجنٹ کے وکیل کی حیثیت سے میں آپ سے کہتا ہوں کہ مسٹر گاندھی کے

متعلق جو حکم آپ کو ملا ہے اس سے آپ اپنے آپ کو بری خیال کریں۔ اس طرح کپتان سے بات چیت کے بعد وہ میرے پاس آئے اور کچھ اس طرح سے بولے کہ اگر آپ کو زندگی کا خوف نہ ہو تو میں چاہتا ہوں کہ شریمتی گاندھی اور بچے گاڑی میں رستم جی سیٹھ کے ہاں چلے جائیں اور میں اور آپ دونوں عام راستہ سے ہو کر پیدل چلیں۔ رات کے اندھیرا پڑ جانے پر چپکے چپکے شہر میں جانا مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ مگر اب تو ہر طرف امن ہے۔ گورے منتشر ہو گئے ہیں اور میرا تو یہی خیال ہے کہ آپ کا اس طرح چھپ کر جانا بہتر نہیں ہے۔

میں اس خیال سے متفق ہو گیا۔ استری اور بچے رستم جی سیٹھ کے ہاں گاڑی میں گئے اور صحیح سلامت جا پہنچے اور میں کپتان سے اجازت مانگ کر مسٹر لائن کے ساتھ جہاز سے اترا۔ رستم جی سیٹھ کا گھر کوئی دس میل دور تھا۔

جونہی ہم جہاز سے اترے۔ چند گورے لڑکوں نے مجھے پہچان لیا اور وہ گاندھی گاندھی چلائے۔ فی الفور دو چار آدمی اکٹھے ہو گئے اور میرا نام لے کر زور سے چلانے لگے۔

مسٹر لاٹن نے دیکھا کہ بھیڑ زیادہ ہو جائے گی۔ اس لیے انہوں نے رکشا منگوائی۔ اگرچہ مجھے رکشا میں بیٹھنا کبھی اچھا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ مجھے اس کا یہ پہلا ہی تجربہ ہونے والا تھا مگر چھوکرے کیوں بیٹھنے دیتے۔ انہوں نے رکشا والے کو ڈرا کر بھگا دیا۔

ہم آگے بڑھے۔ بھیڑ بھی بڑھتی جاتی تھی۔ مجمع کافی ہو گیا سب سے پہلے ہجوم نے مجھے مسٹر لاٹن سے الگ کر ڈالا۔ اس کے بعد مجھ پر پتھر اور سڑے ہوئے انڈوں کی بارش ہونے لگی۔ کسی نے میری پگڑی بھی اڑا دی اور مجھ پر لاتیں جمنی شروع ہو گئیں۔

آخر کار مجھے غش آ گئی۔ نزدیکی مکان کی جالی پکڑ کر میں نے سہارا لیا۔ کھڑا رہنا تو ناممکن تھا۔ اب تھپڑ گھونسے بھی پڑنے لگے۔

اتنے میں پولیس سپرنٹنڈنٹ کی عورت جو مجھے جانتی تھی ادھر سے ہو کر آ نکلی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور دھوپ کی عدم موجودگی میں بھی مجھ پر اپنا چھاتا تان دیا۔ یہ دیکھ کر بھیڑ کچھ دب گئی۔ اب اگر وہ وار کرتے بھی تو مسز الیگزینڈر کو بچا کر ہی کر سکتے تھے۔

اسی اثناء میں کوئی ہندوستانی مجھ پر حملہ ہوتا دیکھ کر تھانے میں چلا گیا۔ سپرنٹنڈنٹ

الیگزینڈر نے پولیس کا ایک دستہ میرے بچانے کے لیے بھیجا اور وہ وقت پر آ پہنچا۔ میرا راستہ پولیس چوکی سے ہی ہو کر گزرتا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ نے مجھے تھانہ میں ہی ٹھہرنے کا مشورہ دیا مگر میں نے انکار کر ڈالا اور کہا جب لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوگا تو خود بخود خاموش ہو جائیں گے۔ مجھے ان کی منصف مزاجی پر اعتماد ہے۔

پولیس کی نگرانی میں صحیح سلامت پارسی رستم جی کے گھر پہنچا مجھے پیٹھ پر چوٹ آئی تھی۔ زخم صرف ایک ہی جگہ ہوا تھا۔ جہاز کے ڈاکٹر وادی برزورجی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے میری اچھی خدمت کی۔

اس طرح مکان میں اطمینان تھا۔ مگر باہر سے گوروں نے مکان کو گھیر لیا۔ شام ہوگئی تھی۔ تاریکی غالب آ گئی تھی۔ باہر ہزاروں لوگ شور مچا رہے تھے کہ گاندھی کو ہمارے سپرد کر دو۔ موقعہ کی نزاکت دیکھ کر سپرنٹنڈنٹ الیگزینڈر خود وہاں پہنچ گئے تھے اور ہجوم کو خوفزدہ کر کے نہیں بلکہ ہنسی مخول کرتے ہوئے قابو میں رکھ رہے تھے۔

مگر اس کے باوجود ان کا فکر دور نہ ہوا۔ انہوں نے مجھے اس مضمون کا پیغام بھیجا کہ اگر آپ اپنے دوست کے جان مال کو مکان اور بال بچوں کو بچانا چاہتے ہوں تو میں جس طرح بتاؤں آپ کو چھپ کر گھر سے نکل جانا چاہیے۔ سپرنٹنڈنٹ کی تجویز کے مطابق میں نے ہندوستانی سپاہی کی وردی پہن لی اور کہیں سر پر چوٹ نہ لگ جائے۔ اس خیال سے سر پر ایک پیتل کی طشتری رکھ لی اور اوپر مدراسی ٹائپ کا ایک لمبا صافا لپیٹ لیا۔ ساتھ دو جاسوس تھے۔ جن میں سے ایک نے ہندوستانی تاجر کا بہروپ بنایا ہوا تھا اور چہرے پر ہندوستانی لوگوں کی رنگت کا پوڈر مل لیا تھا۔ مگر دوسرے کے سوانگ کو میں بھول گیا ہوں۔ قریبی گلی سے ہو کر ہم پڑوسی کی ایک دکان میں پہنچے اور گودام میں رکھے ہوئے بوروں کے ڈھیر کی اوٹ سے تاریکی میں بچتے ہوئے مکان کے دوسرے دروازے سے نکل کر بھیڑ سے ہو کر باہر چلے گئے۔ گلی کے منہ پر گاڑی کھڑی تھی۔ اس میں بیٹھ کر ہم اسی تھانے میں پہنچے جہاں ٹھہرنے کے لیے سپرنٹنڈنٹ الیگزینڈر نے پہلے کہا تھا۔ میں نے سپرنٹنڈنٹ اور پولیس کے افسران کا شکریہ ادا کیا۔

اس طرح ایک طرف جب میں دوسری جگہ لے جایا جا رہا تھا تو دوسری طرف

سپرنٹنڈنٹ ہجوم کو گیت سنا رہے تھے۔

چلو اس گاندھی کو ہم اس املی کے درخت پر پھانسی چڑھا دیں۔

جب سپرنٹنڈنٹ کو یہ پتہ چل گیا کہ میں سلامتی سے مقام موعود پر پہنچ گیا ہوں تو انہوں نے لوگوں سے کہا ”لو تمہارا شکار تو اس دکان سے ہو کر صحیح سلامت باہر نکل گیا ہے۔“ یہ سن کر چند لوگ بگڑ اٹھے اور مسکرائے اور کئی لوگوں نے تو ان کی بات کو سچ ہی تسلیم نہ کیا۔

”تو کوئی تم میں سے اندر جا کر دیکھ لے اگر گاندھی وہاں مل جائے تو میں اسے تمہارے حوالے کر دوں گا۔ اگر نہ ملے تو تمہیں اپنے اپنے گھر چلے جانا چاہیے۔ مگر مجھے یہ یقین ہے کہ تم رستم جی کے مکان کو جلاؤ گے نہیں اور گاندھی کے بال بچوں کو کوئی تکلیف نہ دو گے۔“ سپرنٹنڈنٹ بولا۔

ہجوم نے اپنے نمائندے منتخب کیے اور انہوں نے لوگوں کو نہایت یاس کن خبر سنائی چنانچہ سب لوگ سپرنٹنڈنٹ کی مواقعہ کی نزاکت اور چالاکی کی خوب تعریف کرنے لگے اور کچھ لوگ حسد میں جلتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

بعد کو مسٹر چمبرلین نے جنوبی افریقہ کے حاکموں کو تار دیا کہ گاندھی پر حملہ کرنے والوں پر مقدمہ چلایا جائے اور ایسا کیا جائے جس سے گاندھی کو انصاف ملے۔ مسٹر ایسکمب نے مجھے بلایا۔ اور مجھ پر جو حملہ ہوا تھا اس کے لیے اظہار تاسف کیا اور کہا ”آپ یہ ضرور تسلیم کریں گے کہ آپ کو ذرا سی تکلیف ہو تو مجھے بالکل خوشی نہیں ہوگی۔ مسٹر لائٹن کی رائے مان کر فوراً آپ نے اتر جانے کا حوصلہ کیا تھا۔ آپ کو اس بات کا حق تھا لیکن اگر میرے پیغام کے مطابق عمل کیا ہوتا تو یہ حادثہ بالکل نہ ہوتا اور اگر آپ حملہ کرنے والوں کی شناخت کر لیں تو انہیں گرفتار کر کے مقدمہ چلانے کے لیے تیار ہوں۔ مسٹر چمبرلین بھی یہی چاہتے ہیں۔“

میں نے کہا ”میں کسی پر مقدمہ چلانے کے حق میں نہیں ہوں اور بلوائیوں سے ایک دو کو میں پہچان بھی لوں تو انہیں سزا دلانے سے کون سا فائدہ ہوگا اور پھر میں تو انہیں مجرم نہیں ٹھہراتا کیونکہ ان بچاروں کو تو یہ کہا گیا تھا کہ میں نے ہندوستان میں نیٹال کے گوروں کی خوب اچھی طرح مذمت کی ہے اور اس بات پر اگر وہ یقین کریں اور بگڑ اٹھیں تو اس میں حیرت کی کون سی بات ہے؟ قصور تو دوسرے لوگوں کا ہے اور مجھے کہنے دیں تو آپ کا۔ خیال

تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ آپ لوگوں کو صحیح مشورہ دے سکتے تھے مگر آپ نے رائیٹر کے تار پر یقین کیا اور تصور کرلیا کہ میں نے درحقیقت جحت سے کام لیا تھا۔ میں کسی پر مقدمہ چلانے کے حق میں نہیں ہوں جب حقیقی بات لوگوں پر آشکارا ہو جائے گی اور لوگوں کو پتہ چل جائے گا تو اپنے آپ پچھتائیں گے۔"

"کیا آپ مجھے یہ بات تحریر کر کے دیں گے؟ کیونکہ مجھے مسٹر چیمبرلین کو اس مضمون کا تار دینا پڑے گا۔ مگر میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آپ کوئی بات جلدی میں آ کر انہیں لکھ دیں۔ مسٹر لاٹن اور اپنے دوسرے دوستوں سے مشورہ کر کے جو مناسب خیال کریں وہی کیجئے۔ ہاں میں یہ بات جانتا ہوں کہ اگر آپ بلوائیوں پر مقدمہ نہیں کریں تو تمام باتوں کو ختم کرنے کے لیے مجھے بڑی مدد ملے گی اور آپ کی شان اور بھی بڑھ جائے گی۔"

میں نے جواب دیا "اس معاملہ میں میرے خیالات فیصلہ کن حالت پر پہنچ گئے ہیں اور یہ طے ہو چکا ہے کہ میں کسی پر مقدمہ چلانے کے حق میں نہیں ہوں اس لیے میں یہاں ہی آپ کو لکھ دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں نے وہ ضروری خط لکھ دیا۔

حملہ کے ایک دو دن بعد جب میں مسٹر ایسکمب سے ملا تو اس وقت میں تھانے میں ہی تھا۔ میرے ساتھ حفاظت کے لیے دو ایک سپاہی رہتے تھے لیکن جب میں مسٹر موصوف کے پاس لے جایا گیا تھا تو اس طرح حفاظت کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔

جس دن میں جہاز سے اترا اسی دن یعنی زرد جھنڈا اتارتے ہی فوراً نیٹال ایڈوائیزر کا نمائندہ مجھے آ کر ملا تھا اور اس نے کئی باتیں دریافت کی تھیں۔ اس کے تمام سوالات کا میں نے بالتفصیل جواب دیا اور سر فیروز شاہ کے مشورہ کے مطابق اس وقت میں نے کوئی لیکچر بھی تحریر کئے بغیر نہیں دیا تھا چنانچہ اپنے ان تمام مضامین اور تقاریر کا ایک مجموعہ میرے پاس ہی تھا۔ میں نے وہ تحریریں اسے دے دیں اور یہ ثابت کر دیا کہ ہندوستان میں میں نے ایک بات بھی ایسی نہیں کی جو اس سے تیز لہجہ میں جنوبی افریقہ میں نہ کہی ہو اور یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ کرلینڈ اور نادری جہازوں کے مسافروں کے لانے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ ان میں سے کئی تو پہلے ہی نیٹال کے پرانے باشندے تھے اور باقی نیٹال جانے والے

نہیں تھے بلکہ ٹرانسوال جانے والے تھے۔ اس وقت نیٹال میں کام کا مندا تھا اور ٹرانسوال میں کام کاج نہایت اچھی طرح چل رہا تھا۔ آمدن اچھی ہوا کرتی تھی۔ اس لیے زیادہ تر ہندوستانی وہاں جانا پسند کرتے تھے۔

اس وضاحت اور بلوائیوں پر مقدمہ نہ چلانے کا اثر اتنا اچھا ہوا کہ گوروں کو نادم ہونا پڑا۔ اخبارات نے مجھے بری الذمہ ٹھہرایا اور بلوائیوں کو خوب سخت سست سنائیں۔ اس طرح آخر کار مجھے اس واقعہ سے فائدہ حاصل ہوا اور میرا جو فائدہ تھا وہ قوم کا ہی فائدہ تھا۔ اس سے ہندوستانیوں کی عزت بڑھ گئی اور میرا ستیہ آگرہ کا راستہ اور بھی سہل ہو گیا۔

تین یا چار دن بعد گھر آیا اور تھوڑے دنوں میں ہی اپنے کام کاج کی دیکھ بھال کرنے لگ گیا۔

☆☆☆

باب نمبر ۱۹

خدمت گزاری اور سادگی

اگر چہ میرا کام اچھی طرح چل رہا تھا مگر اس کے باوجود میری اس سے تسلی نہیں ہوئی تھی اور ذہن میں یہی جذبہ الجھاؤ پیدا کرتا تھا کہ زندگی زیادہ سادہ ہونی چاہیے اور کچھ نہ کچھ جسمانی سادگی کا کام بھی ہونا چاہیے۔

قدرتاً ایک اپاہج کوڑھی گھر میں آ پہنچا۔ پہلے تو کچھ کھانے کے لیے دے کر ہٹانے کے لیے جی چاہا لیکن بعد کو میں نے اسے ایک کمرہ میں رکھا پھر اس کے زخموں کو دھو کر سیوا شروع کر دی۔

لیکن یہ کتنے دنوں تک ہو سکتا تھا؟ اسے ہمیشہ کے لیے گھر میں رکھنے کی سہولت میسر نہیں تھی اور نہ ہمت تھی۔ اس لیے میں نے اسے گرمٹیوں کے سرکاری ہسپتال میں بھیج دیا۔ اگر اسی قسم کا کوئی خدمت کا کام ہمیشہ ملتا رہے تو کیا یہی بہتر ہو۔ ڈاکٹر بوتھ سینٹ ایڈمس مشن کے رکن اعلیٰ تھے۔ جو بیمار آتا تھا وہ اسے ہمیشہ مفت دوائی دیا کرتے تھے۔ بڑے نیک آدمی تھے اور محبت سے پیش آیا کرتے تھے۔ ان کی نگرانی میں رستم جی پارسی کے دان سے ایک چھوٹا سا ہسپتال کھولا گیا تھا۔ اس میں خدمت گار کے طور پر کام کرنے کو میرا جی چاہنے لگا۔ ایک دو گھنٹہ تک اس میں دوا دینے کا کام رہتا تھا۔ دوا دینے کے لیے وہاں کسی والنٹیر یا بلا تنخواہ آدمی کی ضرورت تھی۔ میں نے اتنا وقت اپنے کام سے نکال کر اس کام کے کرنے کا فیصلہ کیا۔ وکالت کے متعلق میرا کام تو اتنا ہی تھا۔ دفتر میں بیٹھے بیٹھے مشورہ دینا۔ دستاویزات کے مسودے بنانا اور جھگڑوں کو سلجھانا۔ مجسٹریٹ کی پیشی میں بہت کم مقدمے

رہا کرتے تھے۔ جب ایسے مقدمے ہوا کرتے تو میرے رفیق خان ان کی پیروی کرتے تھے۔ وہ میرے بعد آئے تھے اور میرے ساتھ ہی رہتے تھے۔ ان کی اس معاونت کی وجہ سے اس چھوٹے سے ہسپتال میں کام کرنے لگ گیا۔

ہر روز صبح کو میں وہاں جاتا۔ آنے جانے اور کام کاج میں کوئی دو گھنٹے صرف ہوا کرتے تھے۔ اس کام سے میرے جی کو اطمینان حاصل ہوتا تھا۔ بیمار سے حالات پوچھ کر ڈاکٹر کو سمجھانا اور ڈاکٹر کی بتائی ہوئی دوائی تیار کر کے مریض کو دینا...... یہ میرا کام تھا۔ اس کام کے ذریعہ میں مصیبت زدہ ہندوستانیوں کے زیادہ قریب ہونے لگا۔ اس میں زیادہ تر لوگ تامل تیلگو یا شمالی ہندوستان کے گرمٹیا تھے۔ اس تجربہ سے آگے چل کر مجھے کافی سہولیات ملی۔ بوئیر یا جنگ کے زمانہ میں زخمی سپاہیوں کی خدمت اور دوسرے بیماروں کی سیوا میں مجھے اس سے بڑی مدد ملی۔

اس طرح خدمت گزاری کے ذریعہ لوگوں سے جانکار ہونے لگا۔ اس کے علاوہ سادگی کی طرف اور جھکاؤ بڑھ گیا۔

اگر چہ میری بود و ماند شروع میں کچھ شان و شوکت کی تھی لیکن مجھے اس کا خیال نہیں تھا۔ اس لیے گھر گرہستی جماتے ہی میں نے اخراجات کو کم کرنا شروع کر دیا۔ دھلائی کا خرچ قدرے زیادہ نظر آیا۔ دھوبی مقررہ وقت پر کپڑے نہیں لاتا تھا۔ اس لیے دو تین درجن قمیص یا اتنے ہی کالروں سے کم میں کام نہیں چلتا تھا۔ کالر روزانہ تبدیل کرتا۔ مگر قمیص روزانہ نہیں تو تیسرے دن ضرور بدل لیا کرتا تھا۔ اس طرح دگنا خرچ ہوتا تھا۔ یہ مجھے فضول معلوم ہوا۔ اس لیے گھر پر ہی کپڑے دھونے شروع کیے۔ کپڑے دھونے کی کتاب پڑھ کر دھونا سیکھ لیا اور استری کو بھی سکھا دیا۔ اس سے کام کا کچھ بار زیادہ ہوا تو ضرور مگر یہ ایک نئی چیز تھی۔ اس لیے دلچسپی بھی ہوا کرتی تھی۔

پہلے پہل میں نے جو کالر دھویا اسے میں کبھی بھول نہیں سکوں گا۔ اس میں کلپ زیادہ تھا۔ اور استری پوری گرم نہیں تھی۔ اور کالر کے جلنے کے خوف سے استری اچھی طرح دبائی نہیں گئی تھی۔ اس لیے کالر سخت تو ضرور ہو گیا مگر اس میں سے کلپ جھڑتا رہتا تھا۔

اسی کالر کو لگا کر میں عدالت میں پہنچا اور بیرسٹروں کے تمسخر کا آلہ بن گیا لیکن اس

قسم کے ہنسی مذاق کو برداشت کرنے کی ہمت میرے پاس اس وقت بھی کم نہیں تھی۔

ہاتھ سے کالر دھونے کا یہ پہلا تجربہ ہے اس لیے اس سے کلپ جھڑ رہا ہے لیکن اس سے میرا کوئی ہرج نہ ہوا۔ پھر اس بات پر مخول کیا معنی رکھتا ہے۔ میں نے جواب میں وضاحت سے کام لیا۔

مگر ایک دوست نے پوچھا ''کیا دھوبی نہیں مل سکتے؟''

میں نے کہا ''دھوبی کا خرچ مجھے ناگوار معلوم ہو رہا ہے۔ کالر کی قیمت کے برابر دھلائی کا خرچ اور پھر اس کے باوجود دھوبی کی غلامی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ اس کے بجائے میں اسے گھر میں دھو لینا زیادہ پسند کرتا ہوں'' لیکن خود غرضی کی وجہ سے میں اپنے دوستوں کو اچھی طرح سمجھ نہ سکا۔

مجھے کہنا چاہیے کہ آخر کار میں نے اپنے کام کے لائق کپڑے دھونے کی مہارت حاصل کر لی تھی اور اس میں ذرا بھی بناوٹ نہیں کہ دھوبی کی دھلائی سے گھر کی دھلائی کسی پہلو میں کم نہیں رہتی تھی۔ کالر کی سختی اور چمک دھوبی کے دھلے ہوئے کالر سے کسی طرح کم نہیں تھی۔

گوکھلے کے پاس مرحوم مہادیو گوبند رانا ڈے کا ایک یادگاری دوپٹہ تھا۔ گوکھلے اسے بڑی احتیاط سے رکھتے تھے اور خاص مواقعہ پر اس کو استعمال میں لاتے تھے۔ جوہانسبرگ میں ان کے استقبال کی تقریب میں جو پارٹی ہوئی تھی۔ وہ بڑی شاندار تقریر تھی۔ جنوبی افریقہ میں یہ ان کی زبردست تقریر تھی۔ اس لیے اس موقع پر وہ اپنا وہی دوپٹہ استعمال کرنا چاہتے تھے مگر اس میں سلوٹیں پڑ گئی تھیں اور استری کرنے کی ضرورت تھی۔ دھوبی کے پاس بھیج کر فوراً استری کروا لینا ممکن نہیں تھا۔ میں نے کہا ''ذرا میرے علم کا بھی اندازہ کر لیجئے۔''

''تمہاری وکالت پر مجھے اعتماد ہے لیکن اس دوپٹہ پر تمہاری دھلائی کے علم کا تجربہ نہیں کرنے دوں گا۔ اگر تم اسے جلا دو تو؟ جانتے ہو یہ کس قدر قیمتی ہے؟'' یہ کہہ کر انہوں نے بڑے تفخر سے اس تحفہ کی کہانی کہہ سنائی۔

میں نے بڑی نرمی سے ذمہ داری لی کہ داغ نہیں پڑنے دوں گا۔ اس لیے مجھے

استری کرنے کی اجازت مل گئی اور اس کے بعد اپنی مہارت کی سند بھی مل گئی۔ اب اگر دنیا مجھے سند نہ دے تو اس میں کیا ہرج ہے؟

☆☆☆

باب نمبر۲۰

ایک اچھی یاد اور کفارہ

ڈربن اور جوہانسبرگ میں بھی میرے ساتھ کئی دوست اور بہت دفعہ میرے کارکن بھی رہتے تھے۔ وہ عام طور پر ہندو اور عیسائی ہوا کرتے تھے اور اگر صوبجات کے لحاظ سے کہیں تو گجراتی اور مدراسی ہوا کرتے تھے۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ کبھی میرے جی میں ان کی نسبت کوئی بھید بھاؤ پیدا ہوا ہو۔ میں انہیں بالکل گھر کا آدمی خیال کرتا تھا۔ یہ میری خاص صفت بلکہ عادت ہی ہے۔ میرا ایک کلرک عیسائی تھا۔ اس کے ماں باپ پنچم ذات کے تھے۔ کمروں میں پیشاب کے لیے ایک الگ برتن رہتا تھا۔ ان کو صاف کرنے کا کام ہم دونوں عورت مرد کرنے لگے۔ وہ نوکروں کے پیشاب کا برتن نہیں تھا۔ بلکہ جو لوگ سب کو اپنے قبیلہ کا ہی خیال کرنے لگ جاتے تھے۔ وہ خود ہی اسے صاف کر دیتے تھے لیکن یہ پنچم ذات کے کارکن نئے تھے۔ ان کا برتن ہمیں ہی اٹھا کر صاف کرنا چاہیے تھا۔ دوسرے برتنوں کو تو کستورا بائی اٹھا کر صاف کر دیا کرتی تھی۔ لیکن ان بھائی کا برتن اٹھانا انہیں اکھرتا تھا۔ اس لیے ہم دونوں میں کافی تکرار ہوئی اگر میں اٹھاتا ہوں تو اسے اچھا نہیں لگتا تھا اور اس کے لیے خود اٹھانا مشکل تھا۔ آنسو بھی آنکھوں سے ٹپک رہے ہیں۔ ایک ہاتھ میں برتن ہے اور اپنی لال سرخ آنکھوں سے الاہنا دیتی ہوئی کستورا بائی سیڑھیوں سے اتر رہی ہے۔ اس نظارہ کو اب بھی میں اسی طرح بیان کر سکتا ہوں۔

لیکن میں جس قسم کا ہمدرد اور محبت پتی تھا۔ ویسا ہی ضدی اور سخت مزاج بھی تھا۔ میں اپنے آپ کو اس کا استاد مانتا تھا۔ اس لیے میرا خیال تھا کہ وہ میری اندھی تقلید کرے۔ میں اسے خوب ستایا کرتا تھا۔ اس لیے محض اس کے برتن اٹھا کر لے جانے سے ہی میری تسلی

نہ ہوئی۔ میں نے یہ بھی چاہا کہ وہ اس کام کو برضا و رغبت کرے۔ اس لیے میں نے اس کو سخت سست بھی کہا اور جوش سے میں کہہ گیا "دیکھو یہ تکرار میرے گھر میں چل نہیں سکے گی۔"

میری طعنہ زنی کستورا بائی پر تیر کا کام کر گئی۔ اس نے بھرائے کہا۔ "تو سنبھالو اپنا گھر! یہ میں چلی!!"

اس وقت میں ایشور کو بھول گیا تھا۔ میرے دل میں ذرا بھی نرمی باقی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سیڑھی کے پاس ہی باہر جانے والا دروازہ تھا۔ میں اس لاچار کا ہاتھ پکڑ کر دروازے تک کھینچ کر لے گیا۔ دروازہ آدھا کھلا تھا کہ آنکھوں سے گنگا جمنا کہ دھار بہاتی ہوئی کستورا بائی بولی۔

تمہیں تو کوئی شرم ہی نہیں۔ مگر مجھے تو ہے۔ ذرا شرم تو کرو۔ میں باہر نکل کر جاؤں کہاں؟ ماں باپ بھی یہاں نہیں ہیں کہ ان کے پاس جاؤں اور پھر میں ٹھہری عورت۔ اس لیے مجھے تمہارا غصہ برداشت ہی کرنا پڑے گا۔ اب شرم کرو اور دروازہ بند کر لو۔ کوئی دیکھ لے گا تو دونوں کی فضیحت ہوگی۔

میں نے اپنی صورت کو پر جوش تو بنائے رکھا لیکن جی نادم ہو گیا۔ دروازہ بند کر دیا۔ جب استری مجھے چھوڑ نہیں سکتی تھی تو پھر میں اسے چھوڑ کر کہاں جا سکتا تھا؟ اس طرح ہمارے آپس میں کئی بار لڑائی جھگڑے ہوئے لیکن ان کا نتیجہ ہمیشہ ہی اچھا رہا۔ اس میں استری نے تعجب افروز ہمدردی کے ذریعہ ہمیشہ فتح پائی۔

آج میں اس زمانہ کا محبت کا دیوانہ پتی نہیں ہوں اور نہ استاد ہوں بلکہ ہم ایک دوسرے کے معاونت کرنے والے رفیق ہیں اور ایک دوسرے سے الگ رہ کر اچھی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں اور کستورا بائی ایسی والنٹیر بن گئی ہے جو بیماریوں میں نتیجہ کی امید کے بغیر خدمت گاری کیا کرتی ہے۔

میری تقلید کی وجہ سے اس نے اپنی زندگی کو بامراد کر لیا ہے اور بہترین زندگی گزارنے کی میری کوششوں میں اس نے کبھی روڑا نہیں اٹکایا۔ اس لیے اگرچہ ہم دونوں کی عقل اور ہمت میں کافی بعد ہے تاہم میرا خیال ہے کہ ہماری زندگی تسکین افروز سکھی اور باعث تقلید ہے۔

باب نمبر ۲۱

جنگ بوئیر

۱۸۹۷ء سے ۱۸۹۹ء تک کی زندگی کے دوسرے کئی تجربات کو چھوڑ کر اب جنگ بوئیر کی طرف آتا ہوں۔ جب یہ جنگ چھڑی اس وقت ہر پہلو سے میری ہمدردی بوئیروں سے تھی۔ لیکن میں یہ مانتا تھا کہ ایسی باتوں میں اپنے ذاتی خیالات سے کام لینے کا حق ابھی مجھے حاصل نہیں ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں میرے ذہن میں جو تکرار ہوئی اس کا لطیف تجربہ میں نے جنوبی افریقہ کے ستیہ آگرہ کی تاریخ میں کیا ہے۔ جن کو جاننے کی ضرورت ہو وہ اس کتاب کو پڑھ لے یہاں تو اسی قدر ہی لکھنا کافی ہے کہ برٹش حکومت سے میری وفاداری مجھے اس جنگ میں مدد دینے کے لیے زبردستی گھسیٹ کر لے گئی۔ میں نے سوچا کہ جب میں برٹش رعایا کی حیثیت سے حقوق کا مطالبہ کر رہا ہوں تو برٹش رعایا ہونے کی وجہ سے مددگار ہونا میرا فرض ہے۔ برٹش حکومت کے زیرِ سایہ ہندوستان کی ہر پہلو سے ترقی ہو سکتی ہے۔ اس وقت میرا یہی خیال تھا۔

اس لیے جتنے بھی مددگار ملتے تھے انہیں لے کر بے شمار مصائب کا سامنا کرتے ہوئے ہم نے زخمیوں کی خدمت کرنے والوں کی ایک جماعت تیار کر لی۔ اب تک انگریزوں کا یہ خیال تھا کہ یہاں کے ہندوستانی تکلیف کے کاموں میں مدد نہیں دیا کرتے۔ مطلب برآری کے علاوہ انہیں اور کوئی بات نہیں سوجھتی اس لیے کتنے ہی انگریز دوستوں نے مجھے یادخیز جواب دیے۔ البتہ ڈاکٹر بوتھ نے خوب حوصلہ دلایا انہوں نے مجھے زخمی سپاہیوں کی سیوا کرنے کی تعلیم دی اور اپنی قابلیت کی میں نے ڈاکٹر سے سند حاصل کی۔

سرکار نے اس سلسلہ میں ہماری درخواست منظور کی اور اس جماعت کے تقریباً ۱۱۰۰ آدمی ہو گئے۔ ان میں چالیس کے قریب بڑے لوگ تھے۔ کوئی تین صد کے لگ بھگ آزاد ہندوستانی بھرتی ہوئے تھے اور باقی گرمیا تھے۔ ڈاکٹر بوتھ بھی ہمارے ساتھ ہی تھے۔ اس جماعت نے اپنا کام اچھی طرح کیا۔ اگرچہ اس کا میدانِ عمل جنگ سے دور تھا اور ان کی حفاظت کے لیے ریڈ کراس کا نشان لگا ہوا تھا مگر اس کے باوجود ضرورت کے وقت میدانِ جنگ کی حدود کے اندر بھی ہمیں کام کرنے کا موقعہ ملا۔ ایسی مصیبت میں نہ پڑنے کا اقرار سرکار نے اپنی مرضی سے ہمارے ساتھ کیا تھا۔ مگر سپیاں کوپ کی شکست کے بعد حالات بدل گئے۔ اس لیے جنرل بولر نے پیغام ارسال کیا کہ اگرچہ آپ زخمیوں کی خدمت کے لیے مجبور نہیں ہیں مگر اس کے باوجود اگر خطرہ کا سامنا کر کے زخمی سپاہیوں یا افسروں کو میدانِ جنگ سے اٹھا کر ڈولیوں میں لے جانے کے لیے تیار ہو جائیں گے تو سرکار آپ کی مشکور ہوگی۔ دوسری طرف ہم تو تکلیف برداشت کرنے کے لیے تیار ہی تھے۔ اس لیے سپیاں کوپ کی جنگ کے بعد ہم گولہ بارود کی حد کے اندر بھی کام کرنے لگ گئے۔

ان دنوں ہم سب کو کئی بار بیس پچیس میل کی منزل بھی کرنی پڑتی تھی۔ ایک بار تو زخمیوں کو ڈولیوں میں رکھ کر کافی دور تک چلنا پڑا تھا۔ جن زخمی بہادروں کو ہم اٹھا کر لے جاتے تھے۔ ان میں جنرل ووڈگیٹ وغیرہ بھی تھے۔ چھ ہفتہ کے بعد ہماری جماعت کو رخصت مل گئی ہماری اس معمولی خدمت کی اس وقت کافی تعریف ہوئی۔ اس سے ہندوستانیوں کی عزت بڑھ گئی۔ ''آخر ہندوستانی ہیں تو حکومت کے وارث ہی۔'' ایسا گیت گاتے ہوئے ہم چلے گئے۔

انسانی طبیعت مصیبت کے وقت کتنی نرم ہو جاتی ہے۔ اس کی ایک شیریں یاد دیئے بغیر یہاں نہیں رہ سکتا۔ ہم لوگ چیولی چھاؤنی کی طرف جا رہے تھے۔ وہ وہی میدان تھا۔ جہاں لارڈ رابرٹ کے بیٹے لیفٹیننٹ رابرٹ کو سخت گولی لگی تھی۔ لیفٹیننٹ رابرٹ کی لاش کو لے جانے کا فخر ہماری جماعت کو حاصل ہوا تھا۔ واپسی کے وقت سخت دھوپ تھی۔ ہم کوچ کر رہے تھے اور سب کے سب پیاسے تھے۔ پانی پینے کے لیے راستہ میں ایک چھوٹا سا جھرنا تھا۔ سوال اٹھا کہ پہلے کون پانی پیئے؟ میں نے سوچا تھا کہ ٹامیوں کے پی لینے کے بعد

ہم پئیں گے۔ ٹامیوں نے ہمیں دیکھ کر فوراً کہا۔ ''پہلے آپ لوگ پی لیں۔'' ہم نے کہا ''پہلے آپ نوش کریں۔'' اس طرح کافی دیر تک ہمارے اوران کے درمیان کھینچا تانی وغیرہ ہوتی رہی۔

اس باب کوختم کرنے سے پہلے مجھے ایک اہم واقعہ کا ذکر کرنا چاہیے جب لیڈی سمتھ پر بوئیروں نے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ اس وقت وہاں جو لوگ تھے۔ ان میں انگریزوں کے علاوہ وہاں کے رہنے والے چند ہندوستانی بھی تھے۔ ان میں چند ایک تو تجارت کرتے تھے اور کچھ ریلوے میں مزدوری یا یورپین لوگوں کے پاس نوکری کرتے تھے۔ ان میں سے ایک پربھوسنگھ تھے۔ لیڈی سمتھ کے کمانڈنگ آفیسر نے اس جگہ کے ہر ایک آدمی کو کچھ نہ کچھ کام سونپ دیا تھا۔ شاید سب سے زیادہ خطرناک اور زبردست ذمہ داری کا کام اس پربھوسنگھ قلی کو سونپا گیا تھا۔ لیڈی سمتھ کے پاس ہی ایک پہاڑی پر بوئیروں نے اپنی توم پوم نامی توپ لگا رکھی تھی۔ جن کے گولوں سے کافی عمارتیں تباہ ہوگئی تھیں اور کئی انسان اور حیوان مارے گئے تھے۔ توپ سے گولہ چھوٹنے کے کم از کم ایک یا دو منٹ بعد وہ اپنے دور کے نشانہ پر پہنچتا تھا۔ اگر گھرے ہوئے لوگوں کو پہلے ہی اطلاع مل جائے تو گولہ کے ان میں گرنے سے پہلے وہ اپنے آپ کو آڑ میں کر لیتے تھے۔ پربھوسنگھ ایک پیڑ پر بیٹھا چھپا رہا کرتا تھا۔ اور جب تک توپیں چلتی رہتیں۔ اس کی آنکھیں پہاڑی کی طرف ہی لگی رہتی تھیں مگر جب وہ توپ چلنے کی چمک دیکھتا گھنٹی بجا دیتا تھا۔ گھنٹی بجتے ہی لیڈی سمتھ کے پاس رہنے والے محتاط ہو جاتے تھے اور فوراً اپنے آپ کو آڑ میں چھپا کر اپنی جان بچا لیتے تھے۔

اس کی بہادری کا ذکر آخر کار لارڈ کرزن تک پہنچا۔ جو اس زمانہ میں ہندوستان کے وائسرائے تھے۔ انہوں نے پربھوسنگھ کو تحفہ کے طور پر کشمیری پوشاک بھجوائی تھی۔

☆☆☆

باب نمبر۲۲

ملک میں واپسی

لڑائی کے کام سے مخلصی پانے کے بعد میں نے سوچا کہ اب میرا کام جنوبی افریقہ میں ختم ہو چکا ہے اور وطن چلے جانا چاہیے۔ جنوبی افریقہ میں رہتے ہوئے میں کچھ نہ کچھ خدمت کا کام تو ضرور کیا کرتا تھا لیکن میں نے دیکھا کہ یہاں کہیں میرا اولین مقصد دولت اکٹھی کرنا ہی نہ ہو جائے۔

وطن سے دوست بھی واپس آ جانے کی تاکید کر رہے تھے۔ میں نے بھی سمجھا کہ واپس وطن چلے جانا میرے لیے زیادہ بہتر رہے گا۔ نیٹال میں مسٹر خان اور من سکھ لال ناظر تھے ہی۔

میں نے رفیقوں سے چھٹی لینے کی استدعا کی۔ چنانچہ بڑی مشکل سے انہوں نے ایک شرط پر چھٹی منظور کی۔ وہ یہ کہ ایک سال کے اندر اندر اگر یہاں کے لوگوں کو میری ضرورت پڑے تو میں جنوبی افریقہ میں چلا آؤں مگر مجھے یہ شرط بڑی مشکل معلوم ہوئی کیونکہ میں محبت کی وجہ سے مجبور تھا۔

کاچے رے تانتنے مینوں ہر جیئے باندھی
جیم تانے تیم تیم نیرے مینوں لگی کٹاری پریم نی

میراں بائی کی یہ تشبیہ کم وبیش مجھ پر صادق آتی تھی اور یہ بھی پر میشور ہی ہیں۔ دوستوں کی بات کو میں ٹال نہیں سکتا تھا۔ اس لیے میں نے وعدہ دے کر اجازت لے لی۔

اس وقت میرا گہرا تعلق صرف نیٹال سے ہی تھا۔ نیٹال کے ہندوستانیوں نے

مجھے پریم امرت سے سرشار کر دیا۔ ہر جگہ سے سپاس نامے حاصل ہوئے اور قیمتی چیزیں پیش کی گئیں۔

۱۸۹۶ء میں جب میں ہندوستان میں آیا تھا تو اس وقت بھی تحائف ملے تھے۔ مگر اس بار کے تحائف اور نظاریز سے میں سخت گھبرایا۔ تحائف میں سونے چاندی کی چیزیں ہی نہیں تھیں بلکہ ہیرے بھی تھے۔

ان تمام اشیاء کو قبول کرنے کا مجھے کیا حق ہو سکتا تھا؟ اگر میں قبول کرلوں تو پھر اپنے جی کو یہ کہہ کر کیسے منع کر سکتا ہوں کہ میں روپیہ لیکر لوگوں کی خدمت نہیں کرتا تھا۔ میرے موکلوں کی چند رقومات کو چھوڑ کر باقی چیزیں میری خدمت مجموعی کی تقریب میں دی گئی تھیں لیکن میرے جی میں تو موکل اور دوسرے رفیقوں میں کوئی بھید نہیں تھا۔ اور چند ایک موکل بھی پبلک کاموں میں مدد دیا کرتے تھے۔

پھر ان تحائف میں ایک پچاس گنی کا ہار کستورا بائی کے لیے تھا۔ مگر اسے جو چیزیں ملی تھیں وہ بھی تو میری ہی سیوا کا نتیجہ نہیں بلکہ اس سے الگ تسلیم نہیں کی جا سکتی تھیں۔

جس شام کو یہ مختلف تحائف ملے تھے۔ وہ رات میں نے ایک پاگل کی مانند بیدار رہ کر کاٹی۔ کمرہ میں ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ لیکن کسی طرح گتھی سلجھ نہ سکی۔ سینکڑوں روپے تحائف میں لینا بوجھ معلوم ہو رہا تھا۔ اور یہ کام کچھ کم بار معلوم نہیں پڑتا تھا۔

خواہ میں اس رقم کو ہضم بھی کر لیتا لیکن میرے بچے اور استری؟ انہیں تعلیم تو سیوا کی مل رہی تھی اور سیوا کی قیمت وصول نہیں کی جا سکتی۔ یہی ہمیشہ سمجھایا جاتا تھا۔ میں گھر میں قیمتی زیور وغیرہ نہیں رکھتا تھا۔ روگ بڑھتا جاتا تھا۔ ان حالات میں طلائی گھڑیاں کون رکھے گا؟ سونے کی منٹھی اور ہیرے کی انگشتریاں کون پہنے گا؟ زیورات کی محبت چھوڑنے کے لیے میں اس وقت بھی لوگوں سے تحریک کیا کرتا تھا۔ اب ان زیورات اور جواہرات کو لے کر میں کیا کروں گا؟

میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ وہ چیزیں میں ہرگز نہیں رکھ سکتا۔ پارسی رستم جی وغیرہ کو ان زیورات کے ٹرسٹی بنا کر ان کے نام ایک چھٹی تیار کی اور صبح ہی عورت اور بچوں سے مشورہ کر کے اپنا بار ہلکا کرنے کا فیصلہ کیا۔

بچے تو فوراً سمجھ گئے اور بولے ''ہمیں زیورات سے کچھ سروکار نہیں ہے۔ ہمیں یہ تمام چیزیں واپس کر دینی چاہئیں اور اگر ضرورت پڑے گی تو کیا ہم خود نہ بنا سکیں گے؟''

میں نے کہا ''تو کیا تم اپنی ماں کو سمجھاؤ گے؟'' میں خوش ہو گیا۔

''بضرور وہ کیسے ان زیورات کو استعمال کریں گی؟ وہ اگر رکھنا چاہے گی تو ہمارے ہی لیے نا؟ لیکن جب ہمیں ان کی ضرورت نہیں ہے تو پھر وہ کیوں ضد کرنے لگیں؟''

مگر کام اندازے سے زیادہ مشکل ثابت ہوا۔

''تمہیں خواہ ضرورت نہ ہو اور لڑکوں کو بھی نہ ہو۔ بچوں کا کیا ہے گا جس طرح سمجھا دیں سمجھ جاتے ہیں۔ مجھے پہننے نہ دو۔ لیکن کیا میری بہوؤں کو ضرورت نہیں پڑے گی؟ اور کون کہہ سکتا ہے کہ کل کیا ہو گا؟ جو شے لوگوں نے اپنی محبت سے دی ہے اسے واپس کر دینا اچھا نہیں ہے۔'' اس طرح گفتگو کا آغاز ہوا اور اس کے ساتھ ہی آنسو بھی اتر آئے۔ لڑکے مصمم رہے پھر بھلا میں کس لیے متزلزل ہوتا۔

میں نے آہستگی سے کہا ''پہلے لڑکوں کی شادی تو ہو لینے دیجئے۔ کم سنی میں ہم ان کی شادی نہیں کرنا چاہتے۔ بڑے ہونے پر جو ان کے جی میں آئے کریں اور کیا ہمیں زیورات اور ملبوسات کی شائق بہوئیں تلاش کرنی پڑیں گی اور اگر اس صورت میں بھی کچھ بنوانا پڑے گا تو میں کہیں چلا گیا ہوں؟''

''ہاں میں تم کو جانتی ہوں۔ وہی تو ہو جنہوں نے میرے زیور بھی اتار لیے تھے۔ جب مجھے ہی پہننے نہیں دیتے تو میری بہوؤں کو تو ضرور ہی لا دو گے۔ لڑکوں کو اسی وقت مرتاض بنا رہے ہو۔ میں ان زیورات کو واپس نہیں کرنے دوں گی اور پھر میرے ہار پر تمہارا حق ہی کیا ہے؟''

''لیکن یہ ہار میری سیوا کی خاطر ملا ہے یا تمہاری۔'' میں نے پوچھا۔

''جیسے بھی ہو۔ کیا تمہاری سیوا میں میری سیوا شامل نہیں ہے؟ مجھ سے جو رات دن مزدوری کراتے ہو کیا وہ سیوا نہیں ہے۔ مجھے رلا دھلا کر جو ایرے غیرے لوگوں کے پاس رکھا اور مجھ سے سیوا کروائی ہے کیا وہ کوئی معنی نہیں رکھتی۔''

یہ باتیں دوسرے الفاظ میں تیز تر تھیں اور میرے جگر کو چھید رہی تھیں لیکن

زیورات کے واپس کرنے کا تو میں فیصلہ کر ہی چکا تھا۔ آخر کار کافی باتوں میں جس طرح بھی
ہوا میں کوئی رائے حاصل نہ کر پایا۔ ۱۸۹۶ء اور ۱۹۰۱ء کے ملے ہوئے نذرانے واپس کر
دیئے گئے۔ ان کا ٹرسٹ بنا کر عوام کی خدمت کے لیے اس کا استعمال میرے اور ٹرسٹیوں
کے مشورہ کے مطابق ہوگا۔ ان شرائط پر وہ رقم بنک میں رکھی گئی۔ ان اشیاء کو فروخت کرنے
کی غرض سے میں کئی بار چندہ اکٹھا کر پایا ہوں۔ آج بھی مصیبت زدگان کی امداد کے لیے وہ
رقم موجود ہے اور اس میں ترقی ہوتی رہتی ہے۔

مجھے اس بات کے لیے کبھی پشیمانی نہ اٹھانی پڑی۔ آگے چل کر کستورا بائی کو بھی
اس کی حقیقت کا پتہ چلنے لگا۔ اس طرح ہم اپنی زندگی میں کافی لالچوں سے بچ گئے ہیں۔

اور میرا یہ پختہ یقین ہوگیا ہے کہ عوام کی تکلیفات کو دور کرنے کی غرض سے جو
عطیات کسی کو ملتے ہیں وہ کسی کی ذاتی شے بالکل نہیں ہو سکتے۔

جب میں ہندوستان میں پہنچا تو اس سال کلکتہ میں ہونے والی کانگرس کے موقعہ
پر مجھے لوگوں کی سیوا کرنے کا کافی موقعہ ملا۔ میں نے والنٹیر وں کو جھاڑو لگانے اور کوڑا
کرکٹ صاف کرنے کا درس دیا اور ساتھ ہی کانگرس کے ایک جنرل سیکرٹری شری یت
گھوشال کے کارکن اور بہروں کا کام کرنے کا موقعہ میسر آیا۔ مرحوم گھوکھلے کا میں کافی مشکور
رہوں گا جنہوں نے میرے وطن واپس آنے کے بعد سے مجھے ہمیشہ اپنا چھوٹا بھائی مانا اور
ان کی مدد سے ہی مجھے کانگرس میں جنوبی افریقہ کے متعلق ایک تجویز پیش کرنے کا موقعہ ملا۔
انہوں نے میرے تمام کاموں میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا اور مجھے ان تمام خاص ہستیوں
سے جانکار کرایا۔ جن سے میری ملاقات وہ بہتر خیال کرتے تھے۔ انہیں کام کرتے دیکھ کر
خوشی تو ہوتی تھی۔ مگر ایک ہدایت بھی ملتی تھی جو کچھ بھی وہ کرتے اس کا ملکی ہمدردی سے گہرا
تعلق ہوا کرتا تھا۔ ان کو اس بات کا بڑا فکر تھا کہ میں بمبئی میں اقامت گزیں ہو جاؤں اور
وکالت کرتا ہوا انہیں پبلک کاموں میں مدد پہنچاؤں۔ میں نے ان کے مشورہ کو بنظر استحسان
دیکھا لیکن مجھے بیرسٹری کی حالت میں اپنی کامیابی پر یقین نہیں آتا تھا۔ میں نے راج کوٹ
میں کام شروع کیا۔ کام اچھی طرح چل پڑا تھا کہ ہمارے گھرانے کے ان ہمدرد دوستوں
یعنی شری کیول رام ماوجی دیو نے جنہوں نے مجھے انگلینڈ بھجوایا تھا اس بات پر بضد ہوئے

کہ میں بمبئی میں جا کر وکالت کروں۔

انہوں نے کہا "آپ تو خدمت خلق کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ اس لیے آپ کو
ہم کاٹھیاوار میں دفن نہیں ہونے دیں گے۔ بولو کب جا رہے ہو؟"

میں نے کہا "میری کچھ رقم نٹیال سے آنے والی ہے۔ اس کے آنے کے بعد چلا
جاؤں گا۔"

ایک دو ہفتوں میں روپے آگئے اور میں چلا گیا۔ وہاں میں نے چیتن گلبرٹ اور
سیانی کے دفتر میں چیمبرس کرایہ پر لئے اور وہاں ہی رک گیا۔

دفتر کے ساتھ ہی میں نے گرگام میں مکان لیا لیکن ایشور نے مجھے مقیم نہ ہونے
دیا۔ ابھی مکان کو لیے کافی دن نہیں ہوئے تھے کہ میرا دوسرا لڑکا منی لال بیمار ہوگیا۔ اسے
سخت بخار نے گھیر لیا تھا۔ بخار اترتا ہی نہیں تھا۔ گھبراہٹ تو اسے تھی ہی لیکن رات کو سرسام
کے آثار نظر آنے لگے۔ اس سے پہلے بچپن میں اسے چیچک کا زبردست حملہ برداشت کرنا پڑا
تھا۔ ڈاکٹر سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا "اس کو دوائی استعمال نہیں کرائی جا سکتی۔ اس وقت
تو اسے انڈے اور مرغی کا شوربا دینے کی ضرورت ہے۔"

منی لال کی عمر دس سال کی تھی اس لیے مجھے اس معاملہ میں کیا پوچھنا تھا؟ اس کا
نگران تو میں ہی تھا اور مجھے ہی فیصلہ کرنا تھا۔ ڈاکٹر ایک پارسی سجن تھے۔ میں نے کہا "ڈاکٹر
صاحب! ہم تو سب سبزی خور ہیں۔ میں تو ان میں سے ایک شے بھی اسے نہیں دینا چاہتا اور
ہی کوئی چیز بتلائیے؟"

ڈاکٹر نے کہا "تمہارے بیٹے کی جان کو خطرہ ہے۔ دودھ اور پانی ملا کر دیا جا سکتا
ہے لیکن اس سے پوری تسلی نہیں ہو سکتی۔ تم جانتے ہو کہ میں کافی ہندو گھرانوں میں جایا کرتا
ہوں لیکن دوائی کے طور پر تو ہم جو چیز کہیں وہی دی جاتی ہے اور وہ اس کا استعمال بھی کرتے
ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم بھی اپنے بیٹے کے ساتھ کوئی سختی نہیں کرو گے تو بہتر رہے گا۔"

میں بولا "آپ جو کہتے ہیں وہ درست ہے۔ آپ کو ایسا کہنا بھی چاہیے لیکن میری
ذمہ داری بہت بڑی ہے۔ اگر لڑکا بڑا ہوتا تو بضرور اس کی خواہش معلوم کرنے کی کوشش کرتا
اور جو وہ چاہتا وہی اسے کرنے دیتا۔ مگر یہاں تو مجھے ہی اس کے لیے سوچنا پڑ رہا ہے۔ میں

تو سمجھتا ہوں کہ آدمی کے دھرم کی پرکھ ایسے مواقعہ پر ہی ہوا کرتی ہے۔ خواہ ٹھیک ہو یا غلط
ہو۔ میں نے تو یہ دھرم مانا ہے کہ آدمی کو گوشت وغیرہ کا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ زندگی کے
ذرائع کی بھی حد ہوا کرتی ہے۔ زندگی کے لیے ہمیں وحشت خیز اشیاء کا استعمال نہیں کرنا
چاہیے۔ میرے دھرم کی مریادا مجھے اور میرے قبیلہ کے لوگوں کو بھی ایسے مواقعہ پر گوشت
وغیرہ استعمال سے روکتی ہے۔ اس لیے آپ جس خطرہ کو دیکھتے ہیں مجھے اسے دور ہی کرنا
چاہیے۔ لیکن میں آپ سے ایک بات چاہتا ہوں۔ آپ کا علاج تو میں نہیں کروں گا۔ مجھے
نبض اور دل کی حرکت کو دیکھنا نہیں آتا۔ بلکہ پانی کے ذریعہ علاج کرنا قدرے جانتا ہوں۔
میں ان طریقوں کو استعمال میں لانا چاہتا ہوں لیکن آپ بلاناغہ منی لال کو دیکھنے آتے رہیں
اور اس کی صحت میں ہونے والی تبدیلی سے مجھے جانکار کرتے رہیں گے۔ تو میں آپ کا
ممنون ہوں گا۔''

نیک ڈاکٹر میری مشکلات کو بھانپ گیا اور میری مرضی کے مطابق انہوں نے منی
لال کو دیکھنے کے لیے آنا منظور کر لیا۔

اگرچہ منی لال اپنی رائے قائم کرنے کے قابل نہیں تھا تاہم ڈاکٹر کے ساتھ میری
جو بات چیت ہوئی تھی۔ وہ اسے میں نے سنائی اور اپنے خیالات کے اظہار کے لیے کہا۔

وہ بولا ''آپ بلاخوف پانی کا علاج کیجئے۔ میں شوربا نہیں پیوں گا اور نہ انڈے
استعمال کروں گا۔'' اس کے اس جواب سے میں ازحد بشاش ہو گیا۔ اگرچہ میں جانتا تھا کہ
اگر میں اسے ان اشیاء کے استعمال کرنے کی تحریک کرتا تو وہ کھا بھی لیتا۔

میں کونی کے علاج بالماء کو جانتا تھا۔ اور اس کے تجربے بھی کئے تھے۔ بیماری میں
فاقہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ میں اس بات سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ کونی کے طریقہ علاج
کے مطابق میں نے منی لال کو کٹی اشنان کرانا شروع کیا۔ میں اسے تین منٹ سے زیادہ ٹب
میں نہیں رکھتا تھا اور تین دن سے صرف سنگترے کے رس میں پانی ملا کر دیتا رہا اور کچھ نہ دیا۔

بخار کم نہیں ہوتا تھا اور رات کو وہ قدرے بڑبڑاتا بھی تھا۔ بخار ۱۰۴ ڈگری تک پہنچ
جاتا تھا۔ جس سے میں سخت گھبرایا۔ اگر بچے کو ہاتھ سے کھو بیٹھا تو دنیا میں لوگ نامعلوم کیا
کہیں گے؟ بڑے بھائی نامعلوم کیا کہیں۔ دوسرے ڈاکٹر کو کیوں نہ بلا لیا جائے؟ یا کسی وئید

سے علاج کرایا جائے۔ ماں باپ کو اپنی ادھوری عقل کی آزمائش کا کوئی حق نہیں ہے۔

اس قسم کے خیالات پیدا ہوتے اور یہ بھی جی میں آتا۔ ''اے انساں! تو جو اپنے
لیے کرتا ہے۔ وہ اپنے بیٹے کے لیے بھی کرے گا۔ بھگوان راضی ہوں گے۔ مجھے پانی کے
علاج پر عقیدت ہے دوائی پر نہیں ہے اور پھر ڈاکٹر زندگی بخشنے ہی والے نہیں ہیں۔ ان کے بھی
آخر کار تجربات ہی ہوا کرتے ہیں۔ زندگی کی روح تو درحقیقت بھگوان کے ہی ہاتھ میں ہے۔
ایشور کا نام لے کر اس پر یقین کرو اور اپنے راستہ سے روگردان ہونے کی کوشش نہ کرو۔''

جی میں اسی طرح کے خیالات کا جوار بھاٹا اٹھتا۔ رات ہو گئی میں منی لال کو لے
کر سویا پڑا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اسے گیلی چادر کی پٹی میں رکھا جائے یہ خیال آتے ہی
میں فوراً اٹھا اور کپڑا لے کر سرد پانی میں تر کیا۔ پھر اسے نچوڑ کر سر سے پاؤں تک لپیٹ دیا۔ اور
اوپر سے دو کمبل اوڑھ دیئے پھر سر پر گیلا تولیا بھی رکھ دیا۔ جسم میں سخت حرارت موجود تھی۔
پسینہ آتا ہی نہیں تھا۔

میں سخت تھک گیا تھا۔ منی لال کو اس کی ماں کو سونپ کر آدھ گھنٹہ کے لیے کھلی ہوا
میں تازگی اور آرام پانے کے لیے چوپاٹی کی طرف گیا۔ رات کے دس بجے ہوں گے۔
لوگوں کی آمدورفت کم ہو گئی تھی مگر میرا اس طرف خیال نہیں تھا۔ اپنے خیالات میں محو جا رہا
تھا۔ ''اے بھگوان! اس دھرم سنکٹ میں تم میری لاج رکھنا'' منہ سے رام رام کا نام تو نکل
ہی رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس لوٹا۔ دل دھڑک رہا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی منی
لال نے آواز دی۔ ''باپو آ گئے؟''

''ہاں بھائی!''

''مجھے اس بلا سے نکالیئے؟ میں تو گرمی سے مرا جا رہا ہوں۔''

''کیوں کیا پسینہ آ رہا ہے؟''

''اجی میں تو پسینے سے تر ہو گیا ہوں۔ اب تو مجھے نکالیئے۔''

میں نے منی لال کا سر دیکھا۔ اس پر پسینہ کی بوندیں موتیوں کی مانند چمک رہی
تھیں۔ بخار کم ہو رہا تھا۔ ایشور کا شکر بجا لایا اور بولا ''منی لال گھبراؤ نہیں اب تمہارا بخار اتر
جائے گا لیکن اگر تھوڑا پسینہ اور آ جائے تو کیا ہی خوب رہے؟''

اس نے کہا ”نہیں باپو! اب تو مجھے آزاد کیجئے۔ پھر دیکھا جائے گا۔“

مجھے صبر آیا ہوا تھا۔ اس لیے باتوں ہی باتوں میں چند منٹ گزر گئے۔ سر سے پسینے کی دھار بہہ نکلی۔ میں نے چادر کو الگ کیا اور جسم کو پونچھ کر سکھا دیا اور پھر باپ بیٹا دونوں سو گئے۔ بڑے آرم سے نیند آئی۔

صبح کو دیکھا تو منی لال کا بخار بہت کم ہو گیا تھا۔ دودھ پانی اور پھلوں پر چالیس دن تک رکھا۔ جس سے میں بے خوف ہو گیا تھا۔ بخار اگرچہ ضدی تھا۔ مگر وہ قابو میں آچکا تھا۔ اور آج میرے بیٹوں میں منی لال ہی سب سے زیادہ تندرست اور طاقتور ہے۔

اس بات کا فیصلہ کون کر سکتا ہے کہ یہ بھگوان کی مہربانی سے یا پانی کے علاج اور کم خوری وغیرہ تدابیر کا نتیجہ ہے؟ بے شک سب لوگ اپنے اپنے خیال سے کام لیتے ہیں لیکن اس وقت میری ایشور نے لاج رکھی۔ میں نے اسی بات کو تسلیم کیا اور آج بھی تسلیم کرتا ہوں۔

☆☆☆

باب نمبر۲۲

دوبارہ جنوبی افریقہ

مگر جونہی میں نے بمبئی میں اقامت کا فیصلہ کیا اور قدرے آرام محسوس کرنے لگا کہ اتنے میں جنوبی افریقہ سے تار آپہنچا۔ چمبرلین یہاں آرہے ہیں۔ تمہیں جلد آجانا چاہیے۔ مجھے اپنے الفاظ یاد تھے۔ اس لیے میں اپنا دفتر بند کر کے روانہ ہو گیا۔

جنوبی افریقہ میں پہنچتے ہی وہاں جس قسم کی دردناک سیاسی حالت میرے دیکھنے میں آئی۔ قارئین کو اس کی تفصیل میں ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جنگ بوئیر کے وقت کی ہندوستانیوں کی خدمات کو فراموش کیا جا چکا تھا اور ہندوستانیوں کی حالت دن بدن ناگفتہ بہ تھی اور ان پر نئی نئی مصیبتیں نازل ہو رہی تھیں۔ چنانچہ میں نے وہاں جاتے ہی سمجھ لیا کہ اگر مجھے وہاں رہنے والے وطن دوستوں کی سچے معنوں میں خدمت کرنی ہے تو مجھے کافی عرصہ تک جنوبی افریقہ میں اقامت اختیار کرنی چاہیے۔ میں نے جوہانسبرگ میں دفتر بنانے کا ارادہ کیا اور تھوڑی کوشش سے شہر کے اچھے محلہ میں مجھے چند کمرے رہائش کے لیے مل گئے۔

ایک طرف تو قومی خدمت میں ڈٹ جانے کا خیال تھا اور دوسری طرف گیتا کو نئے سرے سے پڑھنے لگ گیا۔ جس سے میری باطنی قوت تیز تر ہونے لگی۔

اس بار بھی چند ایک تھیا سوفسٹ دوستوں کے ساتھ ہی میں نے گیتا کا مطالعہ کیا لیکن پہلے سے کافی گہرائی اور دلچسپی کے ساتھ میں نے گیتا کے شلوکوں کو از بر کرنے کی بھی کوشش کی اور مجھے یاد ہے کہ میں نے کم از کم تیرہ باب یاد بھی کر لیے تھے۔

اس گیتا کے پڑھنے کا اثر میرے ساتھ مطالعہ کرنے والوں پر کیسا پڑا ہوگا۔ یہ وہی بتا سکتے ہیں مگر میرے لیے تو گیتا اخلاقی طور پر شاہراہ ہدایت بن گئی ہے اسے میرا دھارمک خزانہ ہی کہنا چاہیے۔ ناواقف انگریزی الفاظ کے تلفظ اور معنی دیکھنے کے لیے جس طرح میں انگریزی ڈکشنری کھولتا تھا۔ اسی طرح اخلاقی امور کی مشکلات اور اس کی پیچیدگیوں کے حل کے لیے گیتا کو استعمال میں لاتا تھا۔ اس کے ''اپری گرہ'' اور ''سم بھاؤ'' وغیرہ الفاظ نے تو مجھے جس طرح گرفت میں ہی لے لیا۔ یہی دھن سوار رہتی کہ ''سم بھاؤ'' کیسے پیدا کروں اور کس طرح اس کا پالن کروں۔ ہماری تذلیل کرنے والا ادھیکاری' رشوت خور اور چلتے چلتے مخالفت کرنے والا اور کل جن کا ساتھ تھا۔ ایسے ساتھی ان میں اور ان دوستوں میں جنہوں نے مجھ پر بھاری نوازشیں کیں۔ کیا ان میں کوئی بھید نہیں ہے۔ ''اپری گرہ'' پر عمل کس طرح ممکن ہے؟ کیا یہ ہمارا جسم ہی ہمارے لیے کم ''اپری گرہ'' ہے؟ استری پرش وغیرہ ''اپری گرہ'' نہیں ہیں تو پھر کیا ہیں؟ کیا کتابوں سے بھری ہوئی ان الماریوں کو آگ لگا دوں؟ لیکن یہ تو گھر جلا کر تیرتھ کرنا ہے؟ خود بخود دل نے آواز دی۔ ہاں گھر بار کو بھونکے بغیر تیرتھ نہیں ہوسکتا لیکن اس پہلو میں انگریزی قانون نے میری مدد کی۔ سنیل کی قانونی چرچا یاد آ گئی اور ''ٹرسٹی'' لفظ گیتا کے مطالعہ سے اچھی طرح سمجھ میں آ گیا اور قانون سے دل میں عقیدت پیدا ہوگئی مجھے اس میں بھی دھرم کی حقیقت نظر آئی۔ ''ٹرسٹی'' ویسے کروڑوں کا اثاثہ رکھتے ہیں مگر اس کے باوجود اس کی ایک پائی پر بھی ان کا حق نہیں ہوتا۔ اسی لیے طالب کو اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔ میں نے یہ سبق گیتا سے سیکھا۔ ''اپری گرہ'' ہونے کے لیے ''سم بھاؤ'' رکھنے کے لیے دلائل سے تبدیلیٔ دل ضروری ہے۔ مجھے یہ بات چراغ کی مانند روشن نظر آنے لگی۔ میں نے بمبئی میں ایک بیمہ کمپنی کے ایجنٹ کے بھرے میں آ کر اپنا دس ہزار کا بیمہ کرا لیا تھا جب میرے دل میں یہ خیالات رونما ہوئے تو میں نے فوراً بمبئی کے دوست بھائی ریوا شنکر بھائی کو لکھا کہ بیمہ پالیسی رد کر دیجئے۔ اگر کچھ روپیہ واپس مل جائے بہتر ہے نہیں تو خیر۔ بال بچوں اور استری کی حفاظت بھگوان خود کریں گے۔ جو ہمارا خالق ہے۔ یہ میرے اس خط کا مطلب تھا اور پتا کی مانند اپنے بڑے بھائی کو لکھا۔ آج تک میں جتنا پس انداز کرتا رہا۔ آپ کے سپرد کرتا رہا۔ اب میری امید چھوڑ دیجئے۔ اب جو کچھ

رہے گا یہاں کے ہی سیوا کے کاموں میں لگے گا۔''

اسی وقت ۱۹۰۴ء میں نے انڈین اوپنین نامی ایک ہفتہ وار اخبار کی ایڈیٹری کا بوجھ اٹھایا۔ اس میں جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے حقوق کے متعلقہ پہلوؤں پر چرچا ہوتی تھی۔ میں نے تھوڑے ہی دنوں میں جان لیا کہ مالی امداد کے بغیر اخبار کا اجرا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے میں اس میں اپنی بچت لگاتا رہا۔ یہاں تک کہ اس طرح کرتے کرتے میں اپنی تمام آمدن اس میں صرف کرتا رہا۔ جس طرح ''ینگ انڈیا'' اور ''نوجیون'' آج میری زندگی کا عکس ہیں۔ اسی طرح انڈین اوپنین بھی تھا۔ میں اس میں ہر ہفتہ اپنی روح کو نقش افروز کرتا اور اس شے کے سمجھانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ جس کو میں ستیہ آ گرہ کے نام سے پہچانتا تھا۔ جیل کے ایام کو چھوڑ کر دس سال تک یعنی ۱۹۱۴ء تک انڈین اوپنین کا شاید ہی کوئی ایسا نمبر چھپا ہو جس میں میں نے ایک لفظ بھی بلا غور و فکر اور ماپ تول کے لکھا ہو۔ یہ اخبار میرے لیے ضبط کی تعلیم کا کام دیتا تھا۔

میں جانتا ہوں کہ اس کے مضامین کی بدولت نقادوں کو بھی اپنی قلم پر قابو رکھنا پڑتا تھا۔ اگر یہ اخبار نہ ہوتا تو ستیہ آ گرہ کی جنگ چل سکتی؟ قارئین اسے اپنا اخبار خیال کرتے تھے اور اس میں انہیں ستیہ آ گرہ کی جنگ اور جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کی حالت کا نقشہ نظر آتا تھا۔

اسی اخبار کے کالموں میں میں نے خوراک کے متعلق ایک سلسلہ مضامین لکھا تھا۔ جو بعد میں کتاب کی صورت میں اشاعت پذیر ہوا اور جس کے انگریزی ترجمہ ''گائیڈ ٹرو ہیلتھ'' نے مشرق اور مغرب کے کئی لوگوں کی زندگی کو کافی بدل دیا ہے۔

☆☆☆

باب نمبر۲۴

ایک کتاب کا حیرت انگیز اثر

کچھ خاص خاص کتب کا اثر میری زندگی پر کافی گہرا پڑا ہے لیکن جس کتاب نے میری زندگی میں سب سے زیادہ انقلاب بپا کیا وہ رسکن کی "ان ٹو دس لاسٹ" ہے۔

۱۹۰۹ء میں انڈین اوپنین کے کاروباری انتظام کے سلسلہ میں مجھے ڈربن جانا پڑا۔ مسٹر البرٹ ویسٹ میرے ایک انگریز دوست تھے۔ وہ پریس کا کام کیا کرتے تھے۔ میری ایما پر وہ اپنا کام چھوڑ کر انڈین اوپنین کے حسابات کو درست کرنے کے لیے ڈربن گئے۔ وہاں جا کر مجھے مطلع کیا کہ اخبار کی مالی حالت نہایت افسوسناک ہے۔ ویسٹ کا یہ خط پڑھ کر میں نیٹال کے لیے چل دیا۔ مسٹر پولک جو میرے رفیق بن چکے تھے۔ مجھے اسٹیشن پر پہنچانے آئے اور رسکن کی مندرجہ بالا کتاب میرے ہاتھوں میں رکھ کر بولے۔ "یہ کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔ آپ کو ضرور پسند آئے گی۔"

چنانچہ اس کتاب کو جو ایک بار پڑھنا شروع کیا تو ختم کیے بغیر چھوڑ نہ سکا۔ اس نے میرے دل پر قابو پالیا۔ جوہانسبرگ سے نیٹال چوبیس گھنٹے کا راستہ ہے۔ ٹرین شام کو ڈربن پہنچتی تھی۔ پہنچتے ہی رات بھر نیند نہ آئی اور اس کتاب کے مطابق زندگی بنانے کی دھن لگ گئی تھی۔

میری زندگی میں اگر کسی کتاب نے فی الفور زبردست عملی تبدیلی پیدا کی ہے تو وہ یہی کتاب ہے۔ بعد کو میں نے اس کا گجراتی میں ترجمہ کیا تھا اور وہ "سرواُدیہ" کے نام سے چھپا بھی ہے۔

میرا یقین ہے کہ جو شے میرے خانہ دل میں بسی ہوئی تھی۔ اس کا پورا پورا عکس میں نے رسکن کی اس کتاب میں پایا۔ اس لیے اس نے میرے دل پر اپنا سکہ جما لیا اور اپنے خیالات پر مجھ سے عمل کرایا۔ ہماری خوابیدہ حسوں کو بیدار کرنے کی جس میں طاقت پائی جاتی ہے وہ شاعر ہے۔ مگر شاعروں کا اثر ہر وقت ایک ہی انداز کا نہیں ہوا کرتا کیونکہ ہر ایک شخص میں ہر ایک نیک خواہش ایک ہی مقدار میں نہیں پائی جاتی۔ "سرواُدیہ" کے اعتقادات کو میں اس طرح سمجھا ہوں۔

۱۔ سب کے بھلے میں اپنا بھلا ہے۔
۲۔ وکیل اور حجام دونوں کے کام کی قیمت یکساں ہونی چاہیے کیونکہ دونوں کو کمائی کا یکساں طور پر حق حاصل ہے۔
۳۔ مزدور اور کسان کی زندگی یعنی مشقت کی زندگی ہی سچی زندگی ہے۔

پہلی بات کو تو میں جانتا ہوں۔ دوسری کا مجھے احساس ہوا کرتا تھا مگر تیسری تو میرے ذہن میں آئی تک نہیں تھی اور پہلی میں مؤخر الذکر دونوں پائی جاتی ہیں۔ "سرواُدیہ" سے یہ بات مجھے اظہر من الشمس ہونے لگی ہے اور دن چڑھتے ہی میں اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنے لگ گیا۔

☆☆☆

باب نمبر ۲۵

فینکس کا قیام

میں نے سب سے پہلے ویسٹ سے اس موضوع پر گفتگو کی۔ میرے ذہن پر "سروادیہ" کا جو اثر ہوا۔ وہ میں نے انہیں بیان کیا کہ اگر انڈین اوپنین کو باہر کھیت میں لے جائیں تو کیا ہی بہتر ہو؟ وہاں سب مل کر رہیں اور ایک ہی قسم کا کھانا استعمال کریں۔ سب لوگ اپنے لیے کھیتی کر لیا کریں اور فرصت کے وقت انڈین اوپنین کا کام کریں۔ ویسٹ کو یہ مشورہ پسند آیا۔ کھانے وغیرہ کا حساب لگایا گیا۔ تو کم از کم تین پونڈ فی کس آیا۔ میں نے فی الفور اخبار میں اشتہار دے ڈالا کہ ڈربن کے قریب کسی بھی سٹیشن کے پاس زمین کی ضرورت ہے۔ جواب میں فینکس کی زمین کا پتہ چلا۔ ویسٹ اور میں زمین دیکھنے گئے۔ ایک ہفتہ میں ہی بیسؔ ایکڑ زمین خرید لی۔ اس میں ایک چھوٹا پانی کا جھرنا تھا۔ آم اور سنگترے کے چند ایک پودے بھی تھے اور ساتھ ہی ۸۔ ایکڑ کا ایک اور ٹکڑا بھی تھا۔ اس میں پھلوں کے پیڑ کافی تھے اور ایک جھونپڑا بھی تھا۔ تھوڑے عرصے بعد اسے بھی خرید لیا گیا۔ دونوں کو ملا کر ایک ہزار پونڈ خرچ آئے۔ پارسی سیٹھ رستم جی میرے اس قسم کے کاموں میں میرے رفیق راہ تھے۔ انہیں میری یہ تجویز نہایت پسند آئی اس لیے انہوں نے اپنے ایک گودام کے ٹین کے چھت وغیرہ جو ان کے پاس پڑے ہوئے تھے۔ رستم جی نے ہمیں دے دیئے۔ تا کہ ہم انہیں اپنے استعمال میں لا سکیں۔ ہم نے چند جھونپڑے تیار کر کے ان پر ٹین کی چھتیں ڈال لیں۔

یہ سب کچھ کرنے کے بعد ہمارے پاس رہنے کے لیے ایک نہایت عمدہ اور

خوشگوار رہائشی جگہ تیار ہو گئی اور انڈین اوپنین کو ہم وہاں لے گئے اور وہاں سب نے مل جل کر کھانے وغیرہ کا بندوبست کرنا شروع کر دیا اور کھیتی باڑی کا کام بھی شروع کر دیا۔ اور فارغ وقت میں انڈین اوپنین کا کام بھی شروع ہو گیا۔ اس طرح ہمیں اپنے کام کے لیے کافی سہولتیں میسر آ گئیں اور ہمارا کام کافی آسان ہو گیا۔ اور ہمارے ساتھیوں کے لیے بھی کافی آسانیاں اور آرام کا موقع مہیا ہو گیا۔

☆☆☆

باب نمبر ۲۶

ضبط کی طرف

میں نے یہ پڑھا تھا۔ میں نے جو کچھ پڑھا تھا۔ اسے محسوس بھی کیا لیکن اس وقت میں یہ چیزیں چھوڑ نہ سکا۔ کیونکہ دونوں چیزیں میں دل سے چاہتا تھا۔

کستورا بائی کو خون جاری رہتا تھا۔ جس کے لیے اس کا آپریشن کرایا تھا۔ اس کے لیے اس کا خون بہنا اگرچہ تھوڑے عرصہ کے لیے بند ہو گیا تھا مگر اس کے بعد پھر وہ جاری ہو گیا۔ اس دفعہ وہ کسی طرح رک نہ سکا۔ پانی کا علاج بھی بیکار ثابت ہوا۔ میرے ان تجربات پر استری کا زیادہ اعتقاد نہیں تھا۔ مگر اس کے باوجود نفرت بھی نہیں تھی اور دوسرا علاج کرنے کی میری عادت بھی نہیں تھی۔ اس لیے جب میرے اس کے علاج سے کوئی آرام نہ ہوا تو میں نے اسے سمجھایا کہ دال اور نمک چھوڑ دو۔ میں نے اسے سمجھانے کی حد کر دی اور اپنی بات کی تائید میں کچھ لٹریچر بھی پڑھ کر سنایا۔ مگر وہ مانتی نہیں تھی۔ آخر کار اس نے جھنجھلا کر کہا ''دال اور نمک چھوڑنے کے لیے اگر آپ سے بھی کوئی کہے تو آپ بھی چھوڑ نہ سکیں گے۔''

اس جواب سے جہاں مجھے دکھ ہوا وہاں مسرت بھی ہوئی کیونکہ اس طرح مجھ اپنی محبت کا ثبوت دینے کا بھی موقعہ ملا۔ خوشی کے عالم میں میں نے فوراً کہا ''تمہارا خیال غلط ہے۔ میں اگر بیمار ہو جاؤں اور مجھے وائید ان چیزوں کے چھوڑنے کے لیے کہے تو ضرور چھوڑ ڈالوں گا۔ مگر ایسا کیوں؟ لو تمہارے لیے آج سے ہی دال اور نمک ایک سال تک کے لیے چھوڑ دیتا ہوں۔ تم چھوڑو نہ چھوڑو مگر میں نے تو چھوڑ دیا ہے۔

یہ سن کر میری استری کو سخت دکھ ہوا۔ وہ کہہ اٹھی ''معاف کرو۔ آپ کی عادت کو

جانتے ہوئے بھی میرے منہ سے نکل گیا۔ اب میں دال اور نمک نہیں کھاؤں گی لیکن آپ اپنی قسم واپس لے لیں۔''

میں نے کہا ''تم دال اور نمک چھوڑ ڈالو۔ تو بہت ہی بہتر رہے گا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں اس سے کافی فائدہ ہوگا لیکن میں جو قسم کھا چکا ہوں وہ ٹوٹ نہیں سکتی۔ مجھے بھی اس سے فائدہ ہی ہوگا۔ بہرصورت اگر آدمی ضبط سے کام لیتا ہے تو اس سے اسے فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے تم اس بات پر زور نہ ڈالو۔ کیونکہ اس طرح مجھے بھی اپنی آزمائش کا موقعہ ملے گا اور تم نے جو ان کے چھوڑنے کا فیصلہ کیا ہے اس پر ثابت قدم رہنے میں تمہیں بھی مدد کرنا ہوگی۔''

''اتنا کہنے کے بعد تو مجھے ماننے کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ آپ بڑے ضدی ہیں۔ آپ نے کسی کا کہنا ماننا سیکھا ہی نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ آنسو بہاتی ہوئی چپ ہو گئی۔

میں اس واقعہ کو قارئین کے سامنے ستیہ آگرہ کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں اور کہنا چاہتا ہوں کہ میں اسے اپنی زندگی کی دلکش یاد خیال کرتا ہوں۔ اس کے بعد کستورا بائی کی صحت خوب سنبھلنے لگی۔ یہ نمک اور دال کے چھوڑنے کا نتیجہ تھا یا اس تیاگ سے کئے ہوئے کھانے کی تبدیلی کا نتیجہ تھا یا اس کے بعد دوسرے اصولوں پر عمل کی میری بیدار مغزی کا پھل تھا۔ میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا مگر یہ دیکھنے میں آیا کہ کستورا بائی کا خشک جسم پھر پنپنے لگا۔ خون کا بہاؤ بند ہو گیا اور وئید راج کی صورت میں میری ساکھ بڑھ گئی۔

اوپر بیان کر چکا ہوں کہ کستورا بائی کی بدولت کھانوں میں کتنی ہی تبدیلیاں ہوئیں لیکن اس کے بعد دن بدن اس میں برہمچریہ کے نکتہ خیال سے تبدیلی کرتا گیا۔

پہلی تبدیلی تھی دودھ کو چھوڑ دینا' دودھ سے خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ بات پہلے پہل رائے چند بھائی سے معلوم ہوئی تھی۔ خوراک کے متعلق انگریزی کتب کے مطالعہ سے اس خیال کا گرویدہ ہوا لیکن جب تک برہمچریہ کا برت نہیں لیا تھا اس وقت تک دودھ چھوڑنے کا ارادہ نہیں کر پایا تھا۔ اس بات کو تو میں کبھی سے سمجھ گیا تھا کہ جسم کی حفاظت کے لیے دودھ کی ضرورت نہیں ہے لیکن اس کا اچانک چھوٹ جانا مشکل تھا۔ ایک طرف میں اس بات کو زیادہ سے زیادہ سمجھتا جاتا تھا کہ ضبطِ نفس کے لیے دودھ چھوڑ دینا چاہیے۔ کلکتہ سے

کچھ اس قسم کا لٹریچر میرے پاس آیا۔ جس میں گوالوں کے ذریعہ گائیوں بھینسوں پر ہونے والے مظالم کا ذکر تھا۔ اس لٹریچر کا مجھ پر بڑا برا اثر ہوا اور اس کے متعلق میں نے کیلن بیک سے بھی ذکر کیا۔

حالانکہ میں کیلن بیک کا تعارف جنوبی افریقہ کے ستیہ آ گرہ کی تاریخ میں کرا چکا ہوں لیکن یہاں ان کے متعلق دو لفظ زیادہ کہنے کی ضرورت ہے۔ ان کی میری ملاقات اچانک ہی ہوگئی تھی۔ وہ مسٹر خان کے دوست تھے۔ مسٹر خان نے دیکھا کہ ان کے خیالات میں تارک الدنیا کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ انہوں نے میرا ان سے تعارف کرایا۔ جن دنوں میری ان سے جان کاری ہوئی ان دنوں ان کے شوق اور فضول اخراجات کو دیکھ کر میں چونک اٹھا تھا لیکن پہلی ملاقات میں ہی انہوں نے مجھ پر دھرم کے متعلق سوال کیا۔ سلسلہ گفتگو میں بھگوان بدھ کی بات ایسے ہی آ گئی۔ اس وقت سے ہمارا تعلق بڑھتا گیا اور وہ اس حد تک کہ ان کے جی میں یہ بیٹھ گیا کہ جو کام بھی کروں وہ انہیں بھی بضرور کرنا چاہیے۔ وہ اکیلے تھے ایسی حالت میں مکان کے خرچ کے علاوہ لگ بھگ بارہ سو روپے ماہوار خرچ کرتے تھے اور اس کے بعد وہ یہاں سے اتنی سادگی پر پہنچے کہ ان کا ماہوار خرچ ایک سو بیس روپے تک پہنچ گیا مگر گھر بار چھوڑ دینے اور جیل سے آنے کے بعد تو ہم دونوں مل کر رہنے لگے تھے۔ اس وقت ہم دونوں اپنی زندگی کافی حد تک سختی سے گزار رہے تھے۔

جب میری ان سے دودھ کے متعلق بات چیت ہوئی تو ہم اکٹھے رہتے تھے۔

ایک بار مسٹر کیلن بیک نے کہا۔ جب ہم دودھ میں اتنے نقائص بیان کرتے ہیں تو پھر اسے چھوڑ کیوں نہ دیں؟ اور یہ لازم تو ہے ہی نہیں۔ ان کی اس رائے سے مجھے بڑی خوشی اور حیرت ہوئی۔ میں نے فوراً ان کی بات کی تائید کی اور ہم نے ٹالسٹائی فارم میں اسی وقت دودھ کو چھوڑ دیا۔ یہ بات ۱۹۱۲ء کی ہے۔

مگر ہمیں اس سے بھی تسکین نہ ملی۔ دودھ چھوڑنے کے تھوڑا عرصہ بعد صرف پھلوں پر گزارنے کا تجربہ شروع ہوا اور پھل کھانے میں بھی یہی خیال غالب تھا کہ سستے سے سستے پھل سے کام چلایا جائے۔ ہم دونوں کی مرضی تھی کہ غریبوں کی مانند زندگی گزاری جائے۔ پھل کھانے میں کافی حد تک چولہا گرم کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس لیے کچی

مونگ پھلی، کیلے، کھجور، لیموں اور زیتون کا تیل۔ یہ ہمارا معمولی کھانا ہو گیا تھا۔

جو لوگ برہمچریہ کے پالن کی خواہش رکھتے ہیں ان کے لیے یہاں ایک چیتاونی دینے کی ضرورت ہے۔ اگرچہ میں نے برہمچریہ کے ساتھ بھوجن اور فاقے کا قریبی تعلق بتایا ہے مگر پھر بھی یہ لازم ہے کہ اس کا حقیقی منتہا ہمارا آلہ خیال ہی ہو۔ کثیف خیالات فاقہ سے ہی پاکیزہ ہوتے ہیں۔ خوراک کا اس پر اثر نہیں پڑتا۔ دلی کثافت غور و فکر سے ہی پاکیزہ ہوتے ہیں۔ خوراک کا اس پر اثر نہیں پڑتا۔ دل کثافت غور و فکر بھگوان کی یاد اور ایشور کی دیا سے دور ہوتی ہے۔ چونکہ آلہ خیال کا جسم سے قریبی تعلق ہے اور کثیف من اپنی خوراک کی تلاش میں رہتا ہے اور اس کی خوراک اور لذائذ کا اس پر اثر ہوتا ہے۔ اس لیے اس پہلو تک خوراک پر قابو رکھنا چاہیے اور فاقہ کے اصول پر بضرور کار بند ہونا لازم ہے۔

میں نے ضبط کے طور پر فاقہ کے تجربہ کو شروع کیا۔ وہ ساون کے دن تھے۔ اس سال ساون اور رمضان مل کر آئے ہوئے تھے۔ گاندھی قبیلہ میں ویشنو برتوں کا ساتھ شیو برتوں کا بھی پالن ہوا کرتا تھا۔ ہمارے گھرانے کے لوگ جس طرح ویشنو مندروں میں جاتے اسی طرح شوالیوں میں بھی جاتے۔ ساون کے مہینہ میں پردوش برت تو ہر سال گھر میں کوئی نہ کوئی رکھتا تھا۔ اس لیے میں نے اس ساون کے مہینہ کے برت رکھنے کا ارادہ کیا۔

اس عظیم الشان تجربہ کا آغاز ٹالسٹائی کے آشرم میں ہوا۔ وہاں ستیہ آ گرہی قیدیوں کے قبیلوں کو اکٹھا کر کے میں اور کیلن رہتے تھے۔ ان میں بچے اور نوجوان بھی رہتے تھے۔ ان کے لیے ایک مدرسہ جاری کیا گیا تھا۔ ان نوجوانوں میں چار پانچ مسلمان بھی تھے۔ انہیں میں اسلامی اعتقادات پر عمل کرنے میں مدد دیتا اور تحریک کرتا تھا نماز وغیرہ میں سہولت بہم پہنچاتا۔ آشرم میں پارسی اور عیسائی بھی تھے۔ اس لیے ہر ایک کو قاعدہ کے مطابق اپنے اپنے دینی مشاغل پر عمل کرنے میں مددگار رہتا۔ مسلمانوں کو روزہ رکھنے پر مجبور کیا۔ اگرچہ کچھ لوگ مجھ پر الزام تراشتے تھے۔ مگر اس کے باوجود ہندوؤں، عیسائیوں اور پارسیوں کو بھی میں نے مسلمانوں کی تقلید کا مشورہ دیا اور اصول ضبط پر عمل کے فوائد سے روشناس کرایا۔ آشرم کے باسیوں میں سے کئی لوگوں نے میری باتوں کو پسند کیا۔ ہندو اور پارسی مسلمان رفیقوں کی پوری پوری تقلید نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ مسلمان دن کے غروب ہونے کا

انتظار ہی کرتے رہتے تھے لیکن دوسرے لوگ ان سے پہلے ہی کھانا کھالیا کرتے تھے تا کہ مسلمانوں کو کھانا پروس کر دے سکیں اور ان کے لیے خاص اہتمام کیا جا سکے۔ علاوہ بریں مسلمان سرغی کرتے یعنی روزہ رکھنے کے لیے طلوع آفتاب سے پہلے کھانا کھاتے تھے۔ مگر دوسرے لوگ ان میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ مسلمان روزہ کے دنوں میں دن کو پانی تک نوش نہیں کرتے تھے مگر باقی لوگ جب چاہتے تھے پی لیا کرتے تھے۔

ان تجربات سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ جس کا آلہ خیال ضبط کی طرف متوجہ ہے۔ اس کے لیے کھانے کے قواعد اور فاقہ بڑے مددگار ہوا کرتے ہیں۔

☆☆☆

باب نمبر ۲۷

وکالت کے زمانہ کی یاد

جنوبی افریقہ میں وکالت کرتے ہوئے جتنے تجربات ہوئے ان کی چند یادداشتیں یہاں تحریر کر دینا چاہتا ہوں۔ جب میں پڑھتا تھا تو اس وقت سنا تھا کہ وکیل کا جھوٹ بولے بنا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ مگر اس بات کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا کیونکہ میں نہ جھوٹ بول کر روپیہ کمانا چاہتا تھا اور نہ کوئی عہدوں کا لالچ تھا۔

جہاں تک یاد ہے وکالت کرتے ہوئے کبھی میں نے حرف باطل کی اوٹ نہیں لی اور وکالت کا ایک بڑا حصہ عوام کی خدمت میں ہی صرف کر ڈالا۔ اس لیے میں جیب خرچ سے زیادہ کچھ نہیں لیا کرتا تھا بلکہ کبھی کبھی تو وہ بھی جانے دیتا تھا۔ موکل کو پہلے ہی بتا دیتا کہ اگر معاملہ جھوٹا ہے تو میرے پاس مت آؤ۔ اور گواہوں کے تیار کرنے کی امید مجھ پر مت رکھنا۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد ہی میری ساکھ یہاں تک بیٹھ گئی کہ کوئی جھوٹا مقدمہ میرے پاس لایا ہی نہیں کرتا تھا اور میرے ایسے موکل ہوتے تھے جو میرے پاس اپنے سچے معاملات ہی لاتے تھے اور اگر ان میں تھوڑا بھی سقم ہوا کرتا تھا تو وہ دوسرے وکیلوں کے پاس لے جایا کرتے تھے۔

جوہانسبرگ کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے۔ میں ایک مقدمہ کی پیروی کر رہا تھا۔ مقدمہ کے دوران میں مجھے پتہ چلا کہ میرے موکل نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ کٹہرہ میں وہ بالکل گھبرا اٹھا تھا۔ میں نے بحث سے اجتناب کرتے ہوئے مجسٹریٹ سے کہا کہ مقدمہ خارج کر دیجیے۔ وکیل مخالف یہ سن کر سخت حیران ہو گیا لیکن مجسٹریٹ یہ دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ اس

واقعہ سے میری وکالت پر کوئی برا اثر نہ پڑا۔ بلکہ مجھے کہنا چاہیے کہ الٹا میرا کام آسان ہو گیا۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ میری صداقت کا یہ اثر ہوا کہ میرے رفیق وکلا پر بھی میرا رعب پڑ گیا اور شہرت بڑھ گئی اور رنگت کے عناد کے باوجود بھی میں چند معاملات میں ان کا محبّ بنتا جاتا تھا۔

رستم جی پارسی کا نام جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں میں کافی شہرت رکھتا تھا۔ پبلک کے کاموں میں وہ میرے عرصہ کے ساتھی تھے۔ ان پر ایک بار بڑی مشکل آ پڑی تھی۔ حالانکہ وہ اپنے کاروبار سے متعلق کئی باتیں میرے ساتھ کیا کرتے تھے۔ مگر اس کے باجود ایک بات مجھ سے چھپا رکھی تھی۔ بمبئی اور کلکتہ سے جو مال منگواتے تھے ان کی چنگی میں چوری کر لیا کرتے تھے۔ حاکموں سے ان کا میل ملاپ بہت اچھا تھا۔ اس لیے ان پر کسی کو شک نہیں گزرتا تھا۔

مگر ایک بار ان کی وہ چوری پکڑی گئی۔ اس حالت میں وہ میرے پاس دوڑے آئے۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ کہنے لگے "بھائی! میں نے آپ کو دھوکہ دیا ہے۔ آج میرا پاپ آشکار ہو گیا۔ میں محصول کی چوری کیا کرتا تھا۔ یہ معاملہ میں نے آپ سے چھپائے رکھا۔ مگر اب اس کے لیے پچھتاتا ہوں۔"

میں نے انہیں دلاسا دے کر کہا "آپ میرے طرزِ عمل سے تو آگاہ ہی ہیں۔ اب مخلصی دنیا تو بھگوان کے ہاتھ میں ہے۔ میں تو آپ کی اسی حالت میں مدد کر سکتا ہوں۔ جب آپ اپنا گناہ تسلیم کر سکیں گے۔"

رستم جی نے کہا "اچھا میں نے آپ کے سامنے قصور مان لیا۔ کیا اس قدر کافی نہیں ہے؟"

مگر میں نے آہستگی سے کہا "آپ نے قصور تو سرکار کا کیا ہے میرے سامنے قبولِ جرم سے کیا فائدہ؟"

ان کے وکیل سے بھی مشورہ لیا۔ مگر انہوں نے میری رائے پسند نہ کی لیکن رستم جی نے میری رائے پر چلنا بہتر سمجھا۔ میں نے کہا "میں چنگی کے افسر اور جنرل اٹارنی دونوں سے ملوں گا کیونکہ ان پر اس مقدمہ کے چلانے کی ذمہ داری ہے۔ میں انہیں سمجھاؤں گا کہ

رستم جی پر جرمانہ کر دیا جائے اگر وہ راضی نہ ہوئے تو آپ کو جیل جانے پڑے گا۔" میں نے انہیں سمجھایا کہ جیل جانا باعث شرم نہیں ہے۔ شرم تو چوری کے معاملہ میں ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ سیٹھ رستم جی نے ان تمام باتوں کو اچھی طرح سمجھ لیا یا نہیں۔ مگر تھے وہ بہادر آدمی۔

انہوں نے کہا "میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ میری گردن آپ کے ہاتھ میں ہے آپ جس طرح مناسب خیال فرمائیں کریں۔"

میں نے اس معاملہ میں اپنی تمام حکمت اور دانائی صرف کر ڈالی۔ میں دونوں افسروں سے ملا اور چوری کا تمام واقعہ بلا جھجک انہیں کہہ دیا۔ مجھے یہ کہنا چاہیے کہ میری حق گوئی کو انہوں نے بھانپ لیا اور میں ان کے سامنے یہ ثابت کر سکا کہ میں نے ان سے کوئی بات در پردہ نہیں رکھی۔

رستم پر مقدمہ نہ چلا بلکہ حکم ہوا کہ جتنی چوری رستم جی نے مانی ہے۔ اس سے دگنے روپے ان سے لے لئے جائیں۔ مگر مقدمہ نہ چلایا جائے۔ رستم جی نے اپنی دروغیدگی لکھ کر شیشے میں فریم بنا کر اپنے دفتر میں لٹکا دیا اور اپنے وارثوں اور ہمراہی بیوپاریوں کو ایسا نہ کرنے کے لیے محتاط کر ڈالا۔

☆☆☆

باب نمبر ۲۸

ستیہ آگرہ کا جنم

جلو بغاوت کے فرد کرنے کے سلسلہ میں سپرد کردہ خدمات کے اختتام کے بعد جب میں اپنے فینکس کے رفیقوں سے اپنی سکیم اور زندگی کے آدرشوں کا ذکر کر رہا تھا۔ مجھے خبر ملی کہ ۲۲/اگست ۱۹۰۶ء کے دن ٹرانسوال حکومت کے گزٹ میں ایک آرڈیننس کا مسودہ چھپا ہے جس کا مقصد ایک طرح سے جنوبی افریقہ میں آباد ہندوستانیوں کی بربادی کرنا تھا۔ جس کی رو سے آٹھ سال یا اس سے زیادہ عمر کے ہر ایک ہندوستانی کو خواہ مرد ہو یا عورت ٹرانسوال کی رہائش کے لیے ایشاٹک رجسٹر میں اپنا کا اندراج کرنا پڑتا اور رجسٹری کا پروانہ حاصل کرنا پڑتا تھا۔ ان پروانوں کو لیتے وقت اپنی پرانی راہداریاں حکومت کے سپرد کر دینی پڑتی تھیں اور عرضی میں اپنا نام سکونت' ذات عمر وغیرہ لکھائی جاتی تھی۔ نام لکھنے والے معروض کا حلیہ لکھ کر اس کے انگوٹھے کا نشان بھی لیا جاتا۔ جو عورت مرد مقررہ وقت میں اپنے نام کو رجسٹر نہ کروا سکیں انہیں ٹرانسوال میں رہنے کے حق سے محروم کیا جاتا اور درخواست نہ دینا جرم سمجھا جاتا۔ اس سلسلہ میں جیل کی سزا بھی دی جاتی یا جرمانہ کیا جا سکتا تھا اور اگر عدالت ملک بدر کرنا چاہیے تو یہ بھی اس کا حق تھا۔

دو دن چیدہ چیدہ ہندوستانیوں کو اکٹھا کر کے میں نے انہیں اس قانون کی نسبت آگاہ کیا۔ ان لوگوں پر بھی وہی اثر ہوا جو مجھ پر ہوا تھا اور حالات کی نزاکت کے وہ لوگ قائل ہو گئے۔ یہ فیصلہ ہوا کہ ایک عام اجلاس بلایا جائے۔

۱۱/ ستمبر ۱۹۰۶ء کو میٹنگ بلائی گئی۔ اس میں جو سب سے اہم تجویز پاس ہوئی وہ

چوتھے نمبر پر تھی اب وہ کافی مقبول ہو چکی تھی۔ میں نے اس تجویز کی میٹنگ میں اچھی طرح وضاحت کر دی جس کا مطلب یہ تھا کہ اس بل کی مخالفت کرنے کے لیے ہر ایک تدبیر کو عمل میں لایا جائے لیکن اس کے باوجود اگر وہ منظور ہو جائے تو ہندوستانیوں کو اسے منظور نہیں کرنا چاہیے۔ اس حالت میں اگر کوئی مصیبت بھی پیش آئے تو اسے برداشت کر لینا چاہیے۔ اس تحریک کو اس وقت غیر جارحانہ مخالفت کہتے تھے۔ بعد کو اسے ستیہ آگرہ کہنے لگ گئے۔

ہمارے احتجاج کے باوجود یہ ریزولیوشن پاس ہو گیا۔ حالانکہ ہم نے پکٹنگ بھی کی اور عوام بھی اس کے خلاف تھے۔ مگر اس کے باوجود چھ ہندوستانیوں نے اپنا نام رجسٹر کروا ہی لیا لیکن جب ایشاٹک صیغہ نے دیکھا کہ سارا زور لگانے کے باوجود بھی انہیں پانچ سو سے زائد لوگ رجسٹری کرانے والے نہیں ملے تو انہوں نے گرفتاریاں جاری کر دیں۔ جرمسٹن میں ہندوستانی کافی تعداد میں رہتے تھے۔ ان میں ایک رام سندر بھی تھے۔ وہ بڑا بہادر اور ہوشیار تھا۔ اس کے گرفتار ہونے پر صرف جرمسٹن ہی نہیں بلکہ جنوبی افریقہ کے تمام لوگ اس کے جانکار ہو گئے اور عدالت میں بھی رام سندر کی ویسی ہی توقیر ہوئی جس طرح قومی نمائندہ کی ہونی چاہیے۔ کمرہ عدالت حاضرین سے بھر گیا تھا۔ رام سندر کو ایک سال محض کی سزا ہوئی اور وہ جوہانسبرگ کی جیل کے یورپین وارڈ میں الگ کمرہ میں رکھا گیا اور اس کی گرفتاری کا دن بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔

لیکن رام سندر قابل ثابت نہ ہوا۔ قوم اور جیل کے اہلکاروں سے اچھی خدمت پانے کے بعد بھی اسے جیل پسند نہ آئی اور اس نے ٹرانسوال اور اس تحریک کو الوداع کر کے اپنی راہ لی۔

میں نے رام سندر کا یہ قصہ اس کے نقص بیان کرنے کے خیال سے نہیں لکھا۔ بلکہ اس سے ہدایت پانے کے خیال سے تحریر کیا ہے۔ ہر ایک تحریک اور جنگ کے چلانے والے کو چاہیے کہ وہ اس جنگ میں پاک دل لوگوں کو شریک کرے۔

☆☆☆☆

باب نمبر ۲۹

جیل میں

لیکن رام سندر کی گرفتاری سے حکومت کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ بلکہ برعکس اس کے قوم کا حوصلہ وافر تر ہو گیا۔ اشیاٹک صیغہ کے افسر ''انڈین اوپنین'' کے مضامین بڑی توجہ سے پڑھا کرتے تھے۔ جنگ کے متعلق کوئی بات در پردہ نہیں رکھی جاتی تھی۔ قوم اور قومی تحریک کی رفتار کی ہر ایک بات اس اخبار سے معلوم ہو سکتی تھی۔ انہوں نے یہ طے کیا کہ جب تک خاص لیڈروں کو قید نہیں کیا جاتا تب تک لڑائی کی کمر توڑی نہیں جا سکتی۔ اس لیے دسمبر ۱۹۰۷ء میں کئی لیڈروں کو عدالت میں حاضر ہونے کا سمن ملا۔ وہ سب ۲۸ دسمبر سنیچر کو عدالت میں حاضر ہوئے اور ان کو اس بات کا جواب دینا تھا کہ ایشیاٹک قانون کی رو سے رجسٹری نہ کروانے کی وجہ سے ان پر کیوں نہ مقدمہ چلایا جائے؟ مجسٹریٹ نے ہر ایک کا مقدمہ الگ الگ سنا اور تمام ملزموں کو حکم دیا کہ چند ایک تو ۴۸ گھنٹے کے اندر اور کچھ سات یا چودہ دنوں میں ٹرانسوال چھوڑ کر چلے جائیں۔ ۱۰/ جنوری ۱۹۰۸ء حکم کی معیاد ختم ہوتی تھی اور اسی دن ہمیں عدالت میں سزا سنانے کے لیے بلایا گیا۔ کسی نے صفائی تو دینی ہی نہیں تھی۔ سب کا اقبالِ جرم کا ارادہ تھا مگر ہم نے معیاد کے اندر ٹرانسوال کو خیرباد نہ کرنے کا عزم کر لیا۔

میں نے عدالت میں جو بیان دیا۔ اس میں مجسٹریٹ سے اپنے لیے زیادہ سے زیادہ سزا کی استدعا کی مگر اس کے باوجود مجسٹریٹ نے مجھے دو ہی ماہ کی سزا دی۔ جس عدالت میں سینکڑوں بار وکیل کی حیثیت سے کھڑا ہوا تھا اور وکیلوں کے ساتھ کھڑا ہو جاتا تھا وہاں آج میں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا تھا..... یہ خیال کچھ عجیب ضرور معلوم ہوا مگر مجھے یہ اچھی طرح یاد ہے کہ وکیلوں کے ساتھ بیٹھنے میں اپنی جتنی عزت خیال کرتا تھا۔ اس سے

کہیں زیادہ عزت میں نے اس کٹہرے میں کھڑے ہو کر سمجھی۔

عدالت میں سینکڑوں ہندوستانی بھائی وکیل، دوست وغیرہ سامنے کھڑے تھے۔ سزا سناتے ہی مجھے فوراً حوالات میں لے گئے اور وہاں تنہا رکھا گیا۔ ایک پولیس کے سپاہی نے مجھے وہاں ایک بنچ پر بیٹھنے کو کہا اور دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ اس وقت اگرچہ میرے دل میں ذرا جھجک پیدا ہوئی اور گہرے فکر میں مدغم ہو گیا کہ وکالت کہاں گئی؟ گھر بار کہاں گیا؟ اور وہ مجالس کہاں ہیں؟ کیا یہ سب خواب تھا؟ آج تو میں قیدی ہوں مگر اس دو ماہ کے عرصہ میں کیا سے کیا ہو جائے گا؟

کیا پوری سزا کاٹنی پڑے گی؟ اگر متواتر لوگ آتے رہے تو پھر تو یہاں دو ماہ رہنا مشکل ہے لیکن اگر نہ آئیں تو یہ دو ماہ کس طرح کٹیں گے؟ مجھے یہ لکھتے ہوئے جتنا وقت خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اس کے ایک فیصدی حصہ سے بھی کم میرے ذہن میں کئی خیال پیدا ہوئے اور پھر ندامت سے میرا سر جھک گیا۔ میرا یہ کتنا باطل غرور ہے۔ میں تو جیل کو محل بتا رہا تھا۔ اس خونخوار قانون کے مقابلہ میں خواہ کتنی مصیبتیں اٹھانی پڑیں انہیں دکھ کی بجائے سکھ خیال کروں گا اگر جان اور مال بھی قربان کرنی پڑے تو کوئی عذر نہیں کیا جائے گا۔ اب میرے وہ خیالات کہاں رفو چکر ہو گئے؟ بس یہ خیال آتے ہی پھر ہوش آ گئی اور میں اپنی جہالت پر ہنسنے لگا۔ اب دوسرے بھائیوں کو کیسے سزا دی جائے گی۔ انہیں میرے ساتھ رکھا جائے گا یا الگ وغیرہ کئی قسم کے خیالات میں مستغرق ہو گیا اور یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور پولیس کے اہلکاروں نے آ کر مجھے کہا کہ میرے ساتھ چلو۔ میں چل پڑا۔ میرے پیچھے پیچھے اہلکار تھا۔ جیل کی بند گاڑی کے پاس پہنچا تو اس میں مجھے بٹھایا گیا۔ میرے سوار ہوتے ہی گاڑی جوہانسبرگ کی طرف روانہ ہوئی۔

جیل پہنچنے پر میرے کپڑے اتار لئے گئے۔ نام دھام لکھنے کے بعد مجھے ایک بڑے کمرہ میں لے گئے۔ تھوڑی دیر وہاں رکھا گیا کہ اتنے میں میرے دوسرے ساتھی بھی مسکراتے اور باتیں کرتے کرتے آ پہنچے۔ میرے بعد ان کا مقدمہ کس طرح چلا وغیرہ تمام حالات انہوں نے کہہ سنائے۔ ہم سب کو ایک ہی جیل اور ایک ہی بڑے کمرہ میں رکھا گیا۔ اس سے ہمیں بڑی خوشی ہوئی۔

☆☆☆☆☆

باب نمبر ۳۰

جیل کا پہلا تجربہ

چھ بجے ہمارا کمرہ بنا کر دیا گیا۔ وہاں کی جیل کی کوٹھڑیوں کے دروازہ میں آہنی سلاخیں نہیں ہوتی تھیں اور وہ بالکل بند نہیں رہتے تھے۔ عین اوپر دیوار میں ہوا کے لیے روشندان رکھا جاتا ہے۔ اس لیے ہمیں تو یہی معلوم ہوا کہ جس طرح ہم صندوق میں بند ہیں۔

دو تین دن بعد ستیہ آگرہی قیدیوں کے جھنڈ کے جھنڈ آنے لگ گئے۔ وہ سب جان بوجھ کر گرفتار ہوئے تھے۔ ان میں زیادہ تر تو پھیری والے تھے۔ جنوبی افریقہ میں ہر ایک پھیری والے کو خواہ وہ گورا ہو یا کالا ہو پھیری کا پروانہ لینا پڑتا تھا اور پولیس کے طلب کرنے پر بتانا پڑتا تھا۔ اکثر کوئی نہ کوئی پولیس والا تو لائسنس مانگ ہی بیٹھتا تھا۔ اگر کسی کے پاس لائسنس نہ ہوتا تو اسے گرفتار کر لیتے تھے۔ پھیری والے اس کام میں آگے بڑھے۔ ان کے لیے گرفتار ہونا بھی آسان تھا۔ لائسنس بتانے سے انکار کیا نہیں کہ گرفتار کر لیے گئے۔ اس طرح گرفتاریوں کی تعداد ایک ہفتہ میں ایک سو ہو گئی۔ مگر ابھی بند نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے ہمیں اخبار کے بغیر ہی خبر مل جاتی تھی۔ یہ لوگ روزانہ نئی خبریں لاتے تھے۔ جب ستیہ آگرہی کافی تعداد میں گرفتار ہونے لگے تو انہیں سخت قید کی سزا ملنے لگی۔

جوہانسبرگ جیل میں قید محض کے قیدیوں کو صبح کے وقت مکی کا دلیا ملتا تھا جس میں نمک نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ علیحدہ دیا جاتا تھا۔ دوپہر کے ایک دو بجے ایک پاؤ بھات، تھوڑا نمک اور آدھ چھٹانک گھی کے ساتھ ایک پاؤ ڈبل روٹی بھی ملتی۔ آلو اگر چھوٹے ہوتے تو دو

بڑے ہوتے تو ایک ملتا۔ اس لیے اس سے کسی کا پیٹ نہیں بھرتا تھا۔ چاول پتلے پکائے جاتے تھے۔ میں نے جیل کے ڈاکٹر سے کچھ مصالحہ مانگا اور کہا گیا کہ مصالحہ تو ہندوستانی جیلوں میں بھی دیا جاتا ہے۔ یہ سن کر ڈاکٹر نے کڑک کر کہا۔ یہ ہندوستان نہیں ہے قیدی کے لیے ذائقہ کیسا؟ مصالحہ نہیں مل سکتا۔ پھر ہم نے دال مانگی کیونکہ ہمیں جو کھانا دیا جاتا تھا۔ اس میں آنتوں کے لیے قوت بخش چیز ایک بھی نہیں تھی۔ یہ دیکھ کر ڈاکٹر نے جواب دیا کہ قیدیوں کو حکمت کی دلائل سے سروکار نہیں رکھنا چاہیے۔ ہمیں قوت بخش خوراک میں دی جاتی ہے۔ ہفتہ میں دو بار مکی کے بدلے شام کو مسٹر دیتا ایک ہفتہ عشرہ میں الگ الگ صفات والی خوراک مختلف اوقات پر لینے سے اگر آدمی کا پیٹ بھر سکتا ہے تو حکمت کی دلیل بہتر ہے لیکن بات یہ تھی کہ ڈاکٹر کسی صورت میں بھی ہماری بات سننے پر راضی نہیں تھا۔ مگر سپرنٹنڈنٹ نے ہماری استدعا کو منظور کر لیا گیا۔ ہم اپنا کھانا خود ہی پکا لیا کریں۔ تھمبی نائیکو کو ہم نے اپنا رسوئیا بنایا۔ انہیں چوکے میں کئی جھنجھٹ کرنے پڑتے تھے۔ اگر ساگ کم ملتا تو اور مانگتے۔ یہی حالت دوسری چیزوں کی بھی تھی۔ مگر ہمارے ذمہ دوپہر کا کھانا تیار کرنا تھا۔ اس آزادی کے ملنے سے کھانا ذرا تسلی بخش ملنے لگا۔

مگر یہ سہولتیں ملیں یا نہ ملیں ہم سب نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ اس جیل کی سزا کو آرام سے ہی کاٹیں گے۔ ستیہ آگرہی قیدیوں کی تعداد بڑھتے بڑھتے ۱۵۰ تک ہو گئی۔

اس طرح پندرہ دن گزر گئے تھے۔ نئے قیدی خبر لانے لگے کہ سرکار کے ساتھ کوئی صلح کی بات چیت چل رہی ہے۔ مجھے جنرل اسمٹس سے ملنے کے لیے بلایا گیا اور یہ تجویز پیش کی گئی کہ ہندوستانی لوگ اپنی مرضی سے اپنے لائسنس بدلوالیں۔ ان پر قانون کی کوئی پابندی عائد نہیں ہوگی۔ نیا لائسنس ہندوستانیوں کے مشورہ سے بنایا جائے گا اور اگر ہندوستانی اسے اپنی مرضی سے منظور کر لیں تو یہ کالا قانون رد ہو جائے گا اور سب قیدی چھوڑ دیئے جائیں گے۔ ستیہ آگرہی کے رشتہ سے میں ایسے سمجھوتے کو منظور نہیں کر سکتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام قیدی رہا کر دیئے گئے اور میں اپنے ہم وطنوں کو سمجھانے میں لگ گیا کہ سمجھوتے کی کیا شرائط ہیں۔

☆☆☆

باب نمبر ۳۱

ایک ناقابل فراموش ذکر

میں سیدھا جوہانسبرگ پہنچا۔ اسی رات گیارہ بجے اجلاس ہوا۔ اطلاع دینے کے لیے وقت بہت کم ملا تھا اور رات بھی کافی بیت گئی تھی۔ مگر اس کے باوجود ایک ہزار آدمی اکٹھے ہو گئے۔ سبھا میں دو پٹھانوں کے علاوہ کسی نے سمجھوتے کی مخالفت نہیں کی کیونکہ پٹھانوں کی اس صلح سے تسلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنی مرضی سے انگوٹھے کا نشان دینا واجب ہے۔

۱۰ فروری ۱۹۰۸ء کو ہم کئی لوگ پروانے لے کر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ لوگوں کو اچھی طرح سمجھا دیا گیا تھا کہ وہ اپنے آپ پروانے لے لیں۔ یہ بھی طے ہو چکا تھا کہ پہلے دن خاص خاص لوگ پروانے لیں۔ اس کی تین وجوہات تھیں ایک تو یہ کہ لوگوں کے دلوں سے خوف دور کر دیں۔ دوسرے یہ دیکھنا تھا کہ ایشیاٹک آفس کے لوگ کام سچائی اور مہذبانہ انداز سے کرتے ہیں یا نہیں۔ تیسرے قوم کی نگہداشت کرنا۔ میرا دفتر ہی ستیہ آگرہ کا آفس تھا۔ میں وہاں پہنچا ہی تھا کہ دفتر کے سامنے میر عالم اور اس کے دوستوں کو دیکھا۔ میر عالم میرا پرانا موکل تھا۔ اپنے تمام کاموں میں وہ میرا مشورہ لیا کرتا تھا۔ وہ چھ فٹ سے طویل تھا۔ جسم بھی دوہرا تھا۔ آج میں نے میر عالم کو پہلے پہل ہی اس آفس کے باہر کھڑے ہوئے دیکھا۔ وہ اکثر اندر آ کر بیٹھ جایا کرتا تھا۔ اس وقت جب اس نے مجھے دیکھا تو سلام نہیں کیا۔ زندگی میں یہ پہلا موقعہ ایسا آیا تھا۔ مگر جب میں نے سلام کیا تو اس نے بھی سلام کیا۔ میں نے رواج کے مطابق پوچھا۔

"کیسے ہو؟" مجھے کچھ ایسا یاد ہے کہ اس نے جواب میں کہا "اچھا ہوں۔" مگر آج اس کے منہ پر مسرت کے آثار نہیں تھے۔ میں نے یہ دیکھ کر اپنے دل میں نوٹ کر لیا اور اس وقت یہ بھی سوچ لیا کہ ضرور کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہو گی۔ میں دفتر میں داخل ہوا اور جلد ہی یوسف میاں جو سپرنٹنڈنٹ تھے۔ اپنے دوسرے دوستوں کے ساتھ آ پہنچے اور ہم ایشیاٹک آفس کی روانہ ہوئے۔ میر عالم اور اس کے ہمراہی ساتھ ساتھ ہو لیے۔

ایشیاٹک آفس والا مکان میرے مکان سے ایک میل سے بھی کم فاصلہ پر تھا۔ وہ ایک بڑے میدان میں تھا۔ ایک بڑی سڑک پر اس طرف جانا پڑتا تھا۔ آفس کوئی پانچ قدم رہ گیا تھا کہ میر عالم میرے ساتھ آ پہنچا اور اس نے پوچھا "کہاں جا رہے ہو؟"

میں نے جواب دیا "دسوں انگلیوں کے نشان دے کر پروانہ لینا چاہتا ہوں لیکن اگر آپ جاؤ گے تو آپ کو انگلیوں کے نشان نہیں لگانے پڑیں گے۔ تمہارا پروانہ لے کر اس کے بعد اپنا پروانہ چھاپ لگا کر وصول کروں گا۔"

میں یہ کہہ ہی رہا تھا کہ اتنے میں میرے سر پر ایک لاٹھی پیچھے سے آ کر پڑی۔ میں بے ہوش ہو کر اوندھا گر پڑا اور منہ سے نکلا ہے رام اس کے بعد کا مجھے کوئی ہوش نہیں ہے لیکن میر عالم اور اس کے ساتھیوں نے مجھے اور بھی مارا پیٹا۔ چاروں طرف شور مچ گیا۔ راہگیر گورے اکٹھے ہو گئے۔ میر عالم اور اس کے ساتھی بھاگ گئے مگر گوروں نے انہیں پکڑ لیا۔ اتنے میں پولیس بھی آ پہنچی اور انہیں حراست میں لے لیا۔ قریب ہی ایک گورے کا دفتر تھا۔ مجھے اٹھا کر وہاں لے گئے۔ تھوڑی دیر بعد مجھے ہوش آئی تو میں نے ریورنیڈ ڈوک کو اپنے اوپر جھکے ہوئے پایا۔ انہوں نے پوچھا۔

"اب کیسے ہو؟"

میں نے مسکرا کر کہا "میں تو ٹھیک ہوں۔ مگر میرے دانتوں اور پسلیوں میں درد ہے۔ میر عالم کہاں ہے؟"

جواب ملا۔ "وہ اور اس کے ساتھی گرفتار کر لئے گئے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "انہیں تو رہا کر دینا چاہیے۔"

ڈوک نے جواب دیا "یہ ہوتا ہی رہے گا۔ یہاں تو آپ ایک ناواقف آدمی کے

آفس میں پڑے ہیں۔ آپ کے ہونٹ اور رخسار بری طرح زخمی ہیں۔ پولیس ہسپتال لے جانا چاہتی ہے لیکن اگر آپ میرے ہاں چلیں تو میری گھر والی اور میں دونوں آپ کی خدمت کریں گے۔"

میں نے کہا "مجھے اپنے ہاں ہی لے چلئے۔ پولیس کی مہربانی کے لیے میری طرف سے اس کا احسان مان لیجئے۔ انہیں کہیں کہ میں آپ کے ہاں جانا چاہتا ہوں۔"

اتنے میں ایشیاٹک آفس کے افسر مسٹر چمنی بھی آ پہنچے۔ ایک گاڑی میں ڈال کر مجھے اس مہربان پادری کے ہاں لے گئے۔ ڈاکٹر بلایا گیا لیکن اسی اثناء میں میں مسٹر چمنی سے کہا "میں تو امید کرتا تھا کہ آپ کے دفتر میں دسوں انگلیوں کی چھاپ دے کر سب سے پہلے خود پروانہ لوں گا مگر ایشور کو یہ منظور نہیں تھا۔ اب مہربانی کر کے اپنے کاغذات یہاں منگوا کر مجھے رجسٹر کر لیجئے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ مجھ سے پہلے اور کسی کو رجسٹرڈ نہیں کریں گے۔"

انہوں نے کہا "ایسی جلدی کیا پڑی ہے؟ ابھی ڈاکٹر صاحب آتے ہیں۔ آپ کو ذرا تسکین تو ہو لینے دیجئے۔ پھر سب کچھ ہو جائے گا۔ اگر دوسروں کو لائسنس دوں گا تو آپ کا نام سب سے پہلے رکھوں گا۔"

میں نے کہا "یہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے تو قسم کھائی ہے کہ اگر زندہ رہا اور پرماتما نے چاہا تو میں ہی سب سے پہلے لائسنس لوں گا۔ اس لیے یہ تاکید کر رہا ہوں کہ آپ کاغذات لے آیئے۔" مسٹر چمنی جا کر کاغذات لے آیا۔

میرا اور دوسرا کام یہ تھا کہ جنرل ایٹارنی یعنی سرکاری وکیل کو یہ تار دوں کہ میر عالم اور اس کے ساتھیوں نے مجھ پر جو حملہ کیا ہے اس کے لیے میں انہیں مجرم نہیں سمجھتا۔ جس طرح بھی ہو یہ نتیجہ کے طور پر میر عالم اور اس کے ساتھی رہا کر دیئے گئے۔

مگر جوہانسبرگ کے گوروں نے جنرل اٹارنی کو مندرجہ ذیل مضمون کا طویل خط لکھا:

"ملزموں کو سزا دینے یا نہ دینے کے متعلق گاندھی کے خواہ کسی بھی قسم کے خیالات ہوں۔ وہ جنوبی افریقہ میں چل نہیں سکتے۔ خود انہیں ہی مارا گیا ہے۔ اس لیے بے شک وہ ان کا کچھ نہ کریں لیکن ملزموں نے انہیں اس کے گھر جا کر نہیں مارا۔ جرم تو عام راستہ پر ہوا ہے۔ یہ تو

ایک عام تصور ہے۔ کئی انگریز اس بات کا ثبوت دے سکتے ہیں۔ اس لیے ملزمین کا چالان ضرور کیا جائے۔"

چنانچہ سرکاری وکیل نے میر عالم اور اس کے ایک ساتھی کو دوبارہ گرفتار کر لیا اور انہیں چھ چھ ماہ کی سخت سزا ہوئی۔ یہ درست ہے کہ مجھے گواہ بنا کر بلایا نہیں گیا۔

☆☆☆

باب نمبر۳۲

ایک قابل ذکر واقعہ

مسٹر چمنی کاغذات وغیرہ لینے گئے کہ اتنے میں ڈاکٹر آ پہنچے انہوں نے میرا معائنہ کیا۔ ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ اسے سی دیا۔ پسلیوں کی دیکھ بھال کر کے مالش کی دوا دی تا کہ ہونٹ کے ٹانکے بولنے پر ٹوٹنے نہ پائیں۔ اس لیے آہستہ آہستہ باتوں کی اجازت دی۔ جس سے میرا بولنا تو بند ہی ہو گیا۔ صرف ہاتھ ہی سے کام لے سکتا تھا۔

میں نے قوم کے نام ایک معمولی خط گجراتی میں لکھ کر سپرنٹنڈنٹ کے ذریعہ شائع ہونے کے لیے بھیج دیا۔ جو مندرجہ ذیل قسم کا ہے۔

”میری حالت بہتر ہے۔ مسٹر اور مسز ڈوک مجھ پر جان فدا کر رہے ہیں اور میں بہت جلد اپنا کام سنبھالنے کے قابل ہو جاؤں گا۔ مجھے حملہ کرنے والوں سے کوئی ناراضگی نہیں ہے۔ انہوں نے لاعلمی کی وجہ سے ایسا کیا ہے۔ ان پر کوئی مقدمہ نہ چلایا جائے۔ اگر ہم سب بھائی خاموشی اختیار کریں گے تو یہ واقعہ ہمارے لیے مفید رہے گا۔ ہندو لوگ دل میں ذرا بھی رنج نہ لائیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس حادثہ کی وجہ سے ہندو مسلمان میں رنجش نہ پڑے۔ بلکہ محبت بڑھے۔ پرماتما سے میری یہی استدعا ہے۔

مجھے مار کھانی پڑی ہے۔ شاید اور بھی کھانی پڑے مگر اس کے باوجود میں مشورہ دوں گا کہ سب مل کر یہی کوشش کریں کہ ہم میں سے زیادہ

تر لوگ اپنی ساری انگلیوں کے نشان دے ڈالیں۔ قوم اور غریبوں کا اسی میں بھلا ہے اور اسی میں ان کی حفاظت ہے۔

اگر ہم سچے ستیہ آگرہی ہوں گے تو اس مار کی یا مستقبل میں بے اعتمادی کے شبہ سے ہم ذرا بھی خوف نہیں کھائیں گے اور جو انگوٹھے نہ لگانے پر بضد ہیں وہ غلطی کر رہے ہیں۔

میں پرماتما سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ وہ قوم کا بھلا کرے۔ اسے راہ راست پر لے چلے اور میرے خون سے ہندو اور مسلمانوں کو متحد کر ڈالے۔“

مسٹر چمنی کاغذات لے کر واپس آئے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی انگلیوں کے نشان لگوائے۔ اس وقت میں نے ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ ان کے خلاف تو مجھے بڑے سخت مضامین لکھنے پڑے تھے۔ مگر اس وقت میری آنکھوں کے سامنے یہ بات آ گئی کہ موقعہ پڑنے پر آدمی کا دل کتنا نرم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کارروائی میں زیادہ وقت خرچ نہ ہوا۔ مگر اس کے باوجود مسٹر ڈوک اور اس کی استری بڑے مجبور ہو رہے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ میں جلد تندرست ہو جاؤں۔ چوٹوں کے بعد میری ذہنی رغبت کی وجہ سے انہیں دکھ ہو رہا تھا۔ انہیں یہ ڈر تھا کہ کہیں اس بات کا میری صحت پر الٹا اثر نہ پڑے۔ اس لیے تسلی یا دوسرے طریقہ سے وہ پلنگ کے قریب سب سے کو دور لے گئے اور مجھے لکھنے کی ممانعت کر دی۔ میں نے چاہا (جس کو میں نے تحریر کیا) کہ سونے سے پہلے دل کی تسکین کے لیے ان کی لڑکی الوجو اس وقت بچی تھی۔ مجھے میرا پیارا انگریزی بھجن Lead Kindly Light سنا دے۔ میری اس خواہش کو ڈوک نے خوب پسند کیا۔ اس تحریر کے وقت وہ نظارہ میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے۔ اور الو کی وہ دلکش تانیں ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔

☆☆☆

باب نمبر ۳۳

پھر ستیہ آگرہ

اس سے پہلے ہم نے لکھا ہے کہ کس طرح ہندوستانیوں نے خود بخود اپنی رجسٹری کروائی جس سے ٹرانسوال کی حکومت کو بھی قدرے تسکین ملی۔ مگر اب حکومت کی باری تھی کہ وہ کالے قانون کو منسوخ کر ڈالے اگر وہ ایسا کر دیتی تو ستیہ آگرہ کی جنگ بالکل ختم ہو گئی ہوتی۔ مگر اس کالے قانون کی تنسیخ کی بجائے جنرل سمٹس نے ایک نئی ہی کارروائی کی۔ انہوں نے ایک بیان شائع کیا جس کے ذریعہ ایک طرف تو کالا قانون بحال رکھا اور دوسری طرف ان کے بیانوں کو قانونی قرار دیا لیکن اس بیان میں انہوں نے ایک جملہ یہ بھی لکھا کہ جو ہندوستانی اب تک پروانے لے چکے ہیں ان پر کالے قانون کا عمل نہیں ہو گا۔

اس بیان کو پڑھ کر تو میں سخت حیران رہ گیا۔

میں نے جنرل سمٹس کو ایک خط لکھا لیکن سیاست دانوں کا یہ قاعدہ ہوا کرتا ہے کہ وہ عام طور پر ایسی باتوں کا جواب نہیں دیا کرتے جو انہیں الجھا ڈالتی ہوں اور اگر دیتے ہیں تو بھی ہے تو یہ معاملہ چوپٹ ہی۔

اس کے بعد ہم نے حکومت ٹرانسوال کو ایک پرزور چٹھی لکھی جس میں تحریر کیا گیا کہ اگر سمجھوتے کے مطابق کالا قانون منسوخ نہ کیا گیا اس اور اس امر کے فیصلہ کی خبر مقررہ وقت سے پہلے کونسل کو نہ ملی تو وہ ان تمام پروانوں کو جلا دے گی جن کو انہوں نے اکٹھا کیا ہے۔ اس کام کی وجہ سے جتنی بھی مصیبتیں اٹھانی پڑیں انہیں بخوشی لبیک کہا جائے گا۔

اس الٹی میٹم کی معیاد کا آخری دن وہی مقررہ کیا گیا جس دن ایشیاٹک قانون کی

دوسری خواندگی تھی۔ معیاد گزرنے کے دو گھنٹہ بعد پروانوں کے جلانے کا زبردست مظاہرہ کرنے کے لیے ایک جلسہ بلایا گیا تھا اور ستیہ آگرہ کمیٹی نے یہ سوچا تھا کہ اگر سرکار کہیں مناسب جواب بھیج دے تو کسی پہلو میں یہ سبھا بے معنی نہ رہے گی۔ اگر ہمارے خیالات پر ہی سرکار نے عمل کیا تو اس اجلاس کے ذریعہ گورنمنٹ کے فیصلہ کو ہی مشتہر کیا جا سکتا ہے۔

جلسہ شروع ہونے والا تھا کہ اتنے میں ایک والنٹیر سائیکل پر آیا اس کے ہاتھ میں ایک تار تھا۔ وہ حکومت کا جواب تھا۔ اس میں قومی فیصلہ پر اظہار تاسف کرتے ہوئے یہ بتایا گیا تھا کہ حکومت اپنے ارادہ کو بدلنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس تار کو عام اجلاس میں پڑھ کر سنا دیا گیا اور عوام نے اس کا استقبال کیا کہ اگر حکومت اپنی رائے بدل دیتی تو پروانوں کی ہولی جلانے کا موقعہ ہاتھ سے چلا جاتا۔

اجلاس کی کارروائی شروع ہوئی۔ صدر نے حاضرین کو محتاط کیا اور ساری کیفیت واضح کی اور موقعہ کے مطابق تجاویز منظور کی گئیں۔

اس وقت تک کمیٹی کے پاس دو ہزار سے زائد پروانے جلانے کے لیے آ پہنچے تھے۔ ان کے بنڈل کو میں نے ایک کڑاہی میں پھیلا دیا اور اوپر سے مٹی کا تیل ڈال کر آگ جلا دی۔

حاضرین فی الفور اٹھ کھڑے ہوئے اور جب تک وہ لائسنس جلتے رہے تالیوں سے میدان گونج اٹھا۔ مگر ابھی تک کئی لوگوں کے پاس پروانے موجود تھے۔ اب سٹیج پر ان کی بارش ہونے لگی اور وہ بھی آگ میں جھونک دیئے گئے۔

انگریزی اخباروں کے رپورٹر بھی اس جلسہ میں آئے ہوئے تھے۔ ان پر بھی اس نظارہ کا بڑا اثر ہوا۔ انہوں نے اپنے اخباروں کو اس جلسہ کی پوری پوری کیفیت بھیجی ہوئی تھی۔ اسمبلی میں جنرل سمٹس نے ایک اور بل پیش کیا۔ اس کا نام تھا نوآبادیاتی کے محدود اختیارات کا قانون۔ یہ ایسی ترکیب سے بنایا گیا تھا کہ بظاہر وہاں ایک بھی نیا ہندوستانی داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

اس قانون کی مخالفت تو قوم کے لیے نہایت لازم تھی کیونکہ یہ ان کے حقوق پر ایک نئی ضرب کاری تھی۔ اگلے دو سالوں میں پڑوس کے نیٹال سے کافی ستیہ آگرہی اپنی

مرضی سے ٹرانسوال میں آئے تھے اور وہ بوکسرسٹی کی جیل میں رکھے گئے تھے۔ نیٹال کے ان دوستوں کا ساتھ دینے کے ارادہ سے کئی حوصلہ مند لوگ جنہوں نے اپنے پروانے جلا دیئے تھے۔ بازار میں ساگ سبزی کی ٹوکریاں لگانے لگ گئے۔ اس کے لیے لائسنس کی ضرورت تھی اور چونکہ ان کے پاس کوئی سند نہیں تھی۔ اس لیے گرفتار کر لیے گیے۔ ایک وقت ایسا آیا جب بوکسرسٹی جیل میں ہندوستانیوں کی تعداد ۷۵ تک پہنچ گئی تھی۔ حکومت ان ستیہ آ گرہیوں کے طرزِ عمل سے پریشان تھی۔ جیل کی سزا کے باوجود وہ باز نہیں آتے تھے۔ اس لیے اب انہیں جیل کی بجائے ملک بدر کی سزائیں دینی شروع کیں چنانچہ اس سے چند ہندوستانی مایوس ہو گئے مگر کئی زیادہ مستقل مزاج اور خوش ہو کر لڑائی چلاتے رہے۔

☆☆☆

باب نمبر ۳۴

ٹالسٹائی کا آشرم

۱۹۱۰ء تک تو جیل جانے والے گھرانوں کا گزارہ ہر ماہ کچھ رقم دے کر کیا جاتا تھا۔ یہ بات کافی حد تک مایوس کن اور پبلک روپیہ کا ناجائز استعمال ثابت ہوئی۔ مگر جو لوگ متواتر جیل جایا کرتے تھے۔ وہ درمیانی عرصہ کے لیے کہاں رہیں یہ سوال تھا کیونکہ انہیں تو کوئی نوکری پر رکھتا ہی نہیں تھا۔ ان دونوں مشکلات کا ایک ہی علاج تھا وہ یہ کہ تمام ستیہ آ گرہی اور ان کے قبیلے سب باہم مل کر رہیں اور ایک بڑے قبیلہ کے لوگوں کی مانند مل جل کر کام کریں۔ اس کام کے لیے مسٹر کیلن نے اپنی گیارہ سو ایکڑ زمین ہمیں مفت عنایت کی۔ ایک کھیت میں کوئی ایک ہزار کے قریب درخت تھے۔ اس کے سرے پر ایک چھوٹا سا مکان بھی تھا۔ دو کنویں تھے اور ایک جھرنا بھی تھا۔ جہاں سے پاکیزہ پانی دستیاب ہوتا تھا۔ لالی ریلوے اسٹیشن وہاں سے ایک میل کی دوری پر تھا۔ چنانچہ اس زمین پر ستیہ آ گرہی قبائل کو آباد کرنے کا فیصلہ ہوا۔ اس کھیت میں سنگترہ، خرمانی اور بیر کافی مقدار میں پیدا ہوا کرتے تھے۔ جن کو ستیہ آ گرہی اچھی طرح پیٹ بھر کر استعمال کر سکیں۔ پانی کا چشمہ رہائش گاہ سے پانچ سو گز کے فاصلہ پر تھا۔ ہم نے یہ قاعدہ بنایا کہ نوکروں کے ذریعہ کسی قسم کا گھریلو یا مکان وغیرہ بنانے کا کام نہ لیا جائے۔ اس لیے پاخانہ صاف کرنے اور کھانا تیار کرنے کا کام ہر ایک قبیلہ کو خود کرنا پڑتا تھا۔ قبیلوں کی رہائش کا یہ اصول تھا کہ عورتوں اور مردوں کو الگ الگ ہی رکھا جائے۔ اس لیے مکان بھی الگ الگ اور دور دور بنائے گئے تھے۔ شروع شروع میں دس عورتوں اور ساٹھ مردوں کی رہائش کے لیے مکان بنانے کا فیصلہ کیا گیا اور مسٹر کیلن

بیک کے رہنے کے لیے مکان بنانے کا فیصلہ بھی کیا گیا اور ساتھ ہی ایک مدرسہ کی بھی تعمیر لازم تھی۔ اس کے علاوہ بڑھئی خانہ، موچی وغیرہ کے بھی الگ الگ مکان بنانے لازمی تھے۔

یہاں رہائش کے لیے جو لوگ آنے والے تھے۔ وہ گجرات، مدراس، آندھرا اور شمالی ہندوستان کے تھے اور مذہبی لحاظ سے ہندو، مسلمان، پارسی اور عیسائی تھے۔ لگ بھگ چالیس نوجوان، دو تین بوڑھے، پانچ عورتیں اور پچیس تیس بچے تھے۔ جن میں چار پانچ لڑکیاں تھیں۔ اس آشرم میں کمزور آدمی بھی توانا ہو گئے اور ہر ایک محنت کا عادی بن گیا۔ ہر ایک کو کسی نہ کسی کام کے لیے جوہانسبرگ جانا پڑتا تھا اور بچوں کو بھی سیر کا شوق ہوا کرتا تھا۔ مجھے بھی وہاں کام کاج کے لیے جانا پڑتا تھا۔ اس لیے یہ طے ہوا کہ عام کاموں کے لیے جانے والوں کو ہی ریل سے جانے کی چھٹی دی جائے اور جو صرف سیر کے لیے جانے کے خواہشمند ہوں وہ پیدل جائیں۔ البتہ راستہ میں ناشتہ کے لیے ضرور کوئی شے لے جا سکتے ہیں۔ انہیں شہر میں اپنی خوراک کے لیے کوئی خرچ نہیں کرنا چاہیے۔ اگر اس میں اپنی خوراک کے لیے کوئی خرچ نہیں کرنا چاہتے۔ اگر اس قسم کے سخت اصول نہ بنائے جاتے تو جس بچت کے خیال سے جنگل میں آباد ہونے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ وہ ریل کے کرایہ اور شہر کے ناشتہ میں ہی خرچ ہو جاتے۔ ہم لوگ گھر سے جو ناشتہ لے جاتے تھے۔ وہ بھی سادا ہی ہوا کرتا تھا۔ ہاتھ کے پیسے اور موٹے آٹے کی روٹی اور مونگ پھلی سے گھر میں تیار کیا ہوا مکھن اور سنگترے کے چھلکوں کا مربہ ہوا کرتا تھا۔ آٹا پیسنے کے لیے دستی آہنی چکی خریدی گئی اور مونگ پھلی کو بھون کر پیسنے سے مکھن بن جاتا تھا اور یہ مکھن دودھ کے مکھن سے چوتھائی قیمت پر پڑتا تھا۔ سنگترے تو آشرم میں ہی پیدا ہوتے تھے۔ آشرم میں گائے کا دودھ شاید کبھی خریدا جاتا تھا۔ اکثر ڈبہ کے دودھ سے ہی کام چلا لیا جاتا تھا۔ جو لوگ سیر کے لیے جوہانسبرگ جانا چاہتے تھے۔ وہ ہفتہ میں ایک دو بار جاتے۔ مگر اسی دن واپس آ جاتے۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اکیس میل کا فاصلہ تھا۔ پیدل جانے سے اس طرح سینکڑوں روپے بچ گئے۔ اور جانے والوں کو بھی بڑا فائدہ ہوا۔ کئی لوگوں کو چلنے کی عادت پڑ گئی۔ قاعدہ یہ تھا کہ جانے والوں کو رات کے دو بجے اُٹھ کر اڑھائی بجے چل دینا پڑتا تھا۔ کم از کم وقت پر پہنچنے والوں کو چار گھنٹے اور اٹھارہ منٹ لگتے تھے۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ستیہ آگرہیوں کو زیادہ محنتی بنایا جائے۔ ہم نے

سوچا کہ اگر ہم اتنا کر پائیں تو کافی عرصہ تک نبرد آزمائی کر سکیں گے۔ ہم نے جوتوں کے لیے ایک کارخانہ بھی کھول لیا تھا۔ قریب ہی جرمن کیتھولک پادریوں کا ایک مٹھ تھا وہاں چپل بنانا سکھایا جاتا تھا۔ اس مٹھ میں جا کر مسٹر کیلن بیک نے چپل کا کام سیکھا اور مجھے اور دوسرے ساتھیوں کو سکھا دیا۔ میں نے خود درجنوں چپل بنائے اور میرے کئی شاگرد اس فن میں مجھ سے بہت آگے بڑھ گئے۔ ہم ان چپلوں کو اپنے دوستوں میں فروخت بھی کرتے تھے۔ پھر ہم نے بڑھئی کا کام بھی شروع کیا۔ بنچ سے لیکر صندوق تک چھوٹی موٹی چیزیں خود ہی بنا لیتے تھے۔ آشرم کے لیے مدرسہ تو ہونا ہی چاہیے مگر یہ کام سب سے مشکل معلوم ہوا اور اب تک مکمل نہیں ہوا۔ تعلیم کا بار بالخصوص کیلن بیک اور مجھ پر تھا۔ مدرسہ کا وقت بعد دوپہر ہی رکھا جا سکتا تھا۔ مزدوری کرتے کرتے ہم دونوں کافی تھک جاتے تھے اور نیند کے عالم میں آنکھوں پر پانی چھڑک کر غنودگی کو دور کرتے تھے۔ بچوں کے ساتھ ہنسی کھیل کرتے اور ان کا اور اپنا خمار بھی دور کرتے۔ مگر کئی بار یہ تمام کوششیں ناکام رہتیں اور جسم کو ضروری آرام دینا پڑتا تھا لیکن یہ تو پہلا اور سب سے چھوٹا الجھاؤ تھا۔ نیند کے خمار میں ہم کام میں مصروف رہا کرتے تھے اور سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ تامل، تیلگو اور گجراتی ان تینوں زبانوں کے بولنے والوں کو مل کر پڑھایا جاتا تھا۔ ہمیں ہمیشہ مادری زبان کے پڑھانے کا لالچ رہتا تھا۔ میں تامل زبان کو تو کچھ جانتا بھی تھا لیکن تیلگو نہیں جانتا تھا۔ اس حالت میں ایک اکیلا ماسٹر کیا کر سکتا تھا۔ مگر تعلیم کا یہ تجربہ فضول ثابت نہ ہوا۔ لڑکوں میں عدم رغبت نظر نہ آئی۔ ہم ایک دوسرے کے دھرم اور رسم و رواج کی عزت کرنا سیکھے تھے اور چست بھی بن گئے تھے۔

آج بھی ان بچوں میں سے جن کو میں جانتا ہوں ان کے کام کو دیکھ کر مجھے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ٹالسٹائی آشرم میں انہوں نے جو کچھ سیکھا تھا۔ وہ رائیگاں نہیں گیا۔ نامکمل ہی سہی لیکن تھا وہ قابل غور اور دھارمک تجربہ۔ ٹالسٹائی آشرم کی نہایت شیریں یاد سے تعلیمی تجربہ کی یاد کسی پہلو میں بھی کم لذت خیز نہیں ہے۔

☆☆☆

باب نمبر ۳۵

اچھے برے کا میل

ٹالسٹائی آشرم میں مسٹر کیلن بیک نے میرے سامنے ایک سوال پیش کیا۔ اس سے قبل میں نے اس پہلو پر کبھی غور نہیں کیا تھا۔ آشرم میں کئی لڑکے بڑے آوارہ اور شرارتی تھے۔ ان کے ہمراہ میرے تین لڑکے رہتے تھے اور بھی ایسے لڑکے تھے۔ جن کی پرورش میرے بچوں کی طرح ہوئی تھی لیکن مسٹر کیلن بیک کا خیال تو صرف اسی بات کی طرف تھا کہ وہ آوارہ لڑکے اور میرے بچے مل کر نہیں رہ سکتے۔ ایک دن انہوں نے کہا۔

”آپ کا یہ سلسلہ مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔ ان لڑکوں کے ساتھ اگر آپ کے بچے رہیں گے تو اس بات کا نتیجہ بہت برا ہوگا۔ ان آوارہ لڑکوں کی صحبت سے یہ بگڑے بغیر نہیں رہیں گے۔“

یہ بات سن کر مجھے فکر لاحق ہوا یا نہیں۔ اس بات کی تو یاد نہیں ہے۔ میں نے جواب دیا ”اپنے لڑکوں اور ان آوارہ لڑکوں میں تمیز کیسے رکھی جائے؟ اس وقت تک سب کی ذمہ داری مجھ پر ہی ہے۔ اور یہ بچے بھی میرے بلانے پر یہاں آئے ہیں۔ اگر میں انہیں روپے دے دوں تو یہ ابھی جوہانسبرگ جا کر رہائش پذیر ہو جائیں اور اس بات میں تعجب کا امکان نہیں ہے کہ اگر ان کے ماں باپ یہ خیال کرتے ہوں کہ ان لڑکوں نے یہاں آ کر مجھ پر بڑی مہربانی کی ہے۔ یہاں آ کر انہیں تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے اس بات کو آپ اور ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس حالت میں مجھے اپنے فرض کا پورا پورا پتہ چل رہا ہے۔ میرا انہیں اپنے بچوں کے ساتھ ہی رکھنے کا خیال ہے اور کیا میں آج سے ہی اپنے بچوں کو یہ ہدایت دوں کہ تم دوسروں سے اونچے درجہ کے ہو؟ ایسا خیال کرتے ہی میرے

بچوں کو بگڑ جانا لازمی ہے اور اگر موجودہ حالت میں رہے تو یہ اپنے برے بھلے کی خود تمیز کریں گے اور ہم یہ کیوں تسلیم نہ کریں کہ اگر ان میں کوئی صفت ہو تو اسی کا اثر ان کے ہمراہیوں پر ہوگا؟ جو کچھ ہو میں انہیں الگ نہیں کر سکتا اور ایسا کرنے پر اگر کوئی تکلیف بھی پیش آئے تو اس کے لیے بھی میں تیار ہوں۔“

یہ سن کر مسٹر کیلن بیک سر ہلا کر رہ گئے۔

یہ کہا نہیں جا سکتا کہ اس تجربہ کا نتیجہ کیسا رہا اور میں یہ بھی تسلیم نہیں کرتا کہ اس طرح میرے بچوں کا کوئی نقصان ہوا ہو۔ ہاں فائدہ ہوتا ہوا تو البتہ میں نے دیکھا ہے۔ اگر انہیں کوئی بڑا پن کا اثر رہا ہوگا تو وہ چلا گیا وہ سب کے سب باہم مل کر رہنا سیکھ گئے۔

اس تجربہ اور دوسرے تجربات سے میرا یہ خیال استوار ہوا کہ اگر ماں باپ اچھی طرح نگرانی کر پائیں تو ان کے بچوں کو برے لڑکوں کے ساتھ رہنے سے بھی کوئی نقصان نہیں ہو سکتا۔ اپنے بچوں کو گھر میں بند رکھنے سے تو وہ اچھے ہی رہتے ہیں اور باہر نکلنے سے وہ بگڑ جاتے ہیں۔ یہ کوئی قاعدہ نہیں ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ جہاں کئی قسم کے بچے مل کر رہتے اور پڑھتے ہوں۔ وہاں ماں باپ اور ماسٹر کی کافی نگرانی ہو جاتی ہے اور انہیں سخت محتاط رہنا پڑتا ہے۔

اس طرح لڑکے لڑکیوں کی سچائی اور ایمانداری کا درس دلانے اور پڑھانے میں کتنی مشکلات ہیں اس کا تجربہ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ معلم اور نگران کی حیثیت سے مجھے ان کے دلوں میں جگہ پانی تھی اور ان کے رنج و راحت میں شریک ہونا تھا اور مشکلات کو حل کرنا تھا اور ان کی جوانی کی لہروں کو ٹھیک راستے پر لے جانا تھا۔

کئی قیدیوں کے رہا ہونے کے بعد ٹالسٹائی آشرم میں تھوڑے لوگ رہ گئے۔ یہ فینکس کے لوگ تھے۔ اس لیے میں آشرم کو فینکس لے گیا۔ وہاں میرا سخت امتحان ہوا۔ ان لوگوں کو فینکس پہنچا کر میں جوہانسبرگ گیا۔ ابھی وہاں چند دن ہی رہا تھا کہ مجھے دو آدمیوں کی گراوٹ کا پتہ چلا۔ ستیہ آگرہ جیسی جنگ میں اگر کسی جگہ بھی ذرا ناکامی نظر آتی۔ تو اس سے مجھے ٹھیس نہیں پہنچتی تھی مگر اس حادثہ نے تو مجھے بے دم کر ڈالا۔ میرے دل میں زخم ہو گیا اور میں اسی دن فینکس روانہ ہو پڑا۔ مسٹر کیلن بیک نے میرے ساتھ چلنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ وہ میری حالتِ زار کو تاڑ گیا تھا اور کہنے لگا کہ ”آپ کو اکیلا نہیں جانے دوں گا۔“ اس

خامی کا مجھے ان کے ذریعہ ہی پتہ چلا تھا۔ میں نے راستہ میں ہی سوچ لیا کہ موجودہ حالت میں میرا کیا فرض ہوگا؟ میں نے سوچا کہ جو لوگ ہماری نگرانی میں ہیں ان کی گراوٹ کے نگران اور اسٹر بھی ضرور ذمہ دار ہیں۔ بلکہ اس حادثہ میں تو مجھ اپنی ذمہ داری کا پورا پورا احساس ہوگیا۔ مجھے استری نے بہت پہلے ہی محتاط کر دیا تھا۔ مگر میں طبعی طور پر ہر ایک بات پر یقین کر لیا کرتا ہوں۔ اس لیے میں نے اس کی بات پر توجہ نہ دی۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان گرے ہوئے لوگوں کو میری ذہنی کیفیت کا اس وقت پتہ چلے گا جب میں ان کی گراوٹ کے لیے کچھ پرائچت کروں گا۔ اس طرح انہیں اپنے نقائص کا حال معلوم ہوگا۔ اس لیے میں نے ایک ہفتہ کا فاقہ اور پورے چار ماہ تک کے لیے ایک وقت کھانا کھانے کا خیال کیا۔ مسٹر کیلن بیک نے مجھے کافی منع کیا مگر میں نے نہ جانا۔ آخر کار انہوں نے پرائچت کی مناسبت کو تسلیم کر لیا اور اپنے لیے بھی میرے ہمراہ فاقہ کرنے پر زور دیا۔ میں ان کی محبت کو ٹال نہ سکا۔ اس فیصلہ کے بعد فوراً میرا دل ہلکا ہوگیا اور مجھے اطمینان حاصل ہوا اور جو غصہ غالب آیا تھا وہ دور ہوگیا بلکہ ان پر رحم غالب آیا۔

اس طرح ٹرین میں ہی اپنے دل کو ہلکا کر کے میں فینکس پہنچا اور پتہ چلانے پر جو کچھ اور باتیں جاننی تھیں وہ جان لیں۔ اگر چہ میرے اس فاقہ سے سب کو بہت تکلیف ہوئی لیکن اس سے کرہ ہوائی ضرور صاف ہوگیا اور اس پاپ کی خوفناکی کو سب نے محسوس کیا اور طالب علموں اور طالبات کا اور میرا رشتہ اور بھی پختہ اور سرل بن گیا۔

اس حادثہ کے سلسلہ میں ہی تھوڑے عرصہ کے بعد پھر چودہ دن کے برت کی نوبت آئی اور میں مانتا ہوں کہ اس کا نتیجہ کافی امید افزا رہا۔ مگر اس طرح میں یہ ثابت نہیں کرنا چاہتا کہ شاگردوں کے ہر ایک نقص کے لیے ہمیشہ استادوں کو فاقہ ہی کرنا چاہیے مگر یہ ضرور جانتا ہوں کہ موقعہ پڑنے پر ایسے پرائچت کافی مفید رہتے ہیں۔ جہاں استادوں میں پاک محبت کارفرما نہیں ہے اور جہاں شاگردوں کے دل میں استاد کی عزت نہیں پائی جاتی وہاں برت بے فائدہ ہے اور شاید نقصان دہ بھی ہو لیکن ایسے فاقے اور ایک وقت کھانے کے متعلق بے شک کوئی شک کرنا پڑے۔ تاہم شاگردوں کے نقائص کے لیے استاد تھوڑا بہت ضرور ذمہ دار ہیں۔ اس بات میں ذرا بھی شک نہیں ہے۔

☆☆☆

باب نمبر ۳۶

بہنوں کا حصہ -۱

۱۹۱۲ء کی سردیوں میں گوکھلے جنوبی افریقہ میں تشریف لائے۔ ان کی آمد کا مقصد سرکار اور ستیہ آگرہیوں کے درمیان سمجھوتہ کرنا تھا۔ انہوں نے جنرل بوتھا سے ملنے کے بعد ہمیں یہ امید دلائی کہ سارا معاملہ درست ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا "اگلے سال کالا قانون منسوخ ہو جائے گا اور تین پونڈ کا ٹیکس ہٹا دیا جائے گا۔"

دوسرا سال بھی آ گیا۔ مگر ہماری امید بر نہ آئی۔ ۱۹۱۳ء میں ٹالسٹائی آشرم کے بسیوں کو ستیہ آگرہ کی تیاری کرنی پڑی جس کا یہ مقصد تھا کہ تین پونڈ ٹیکس ہٹایا جائے۔

اب تک ہم نے عورتوں کو جیل جانے سے روک رکھا تھا۔ حالانکہ وہ اپنے شوہروں کے ساتھ جیل جانے کے لیے تیار تھیں لیکن اب ایک ایسا واقعہ ہوا جس کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا جس طرح پرماتما خود پوشیدہ طور پر ہندوستانیوں کی کامیابی کے لیے سامان اکٹھا کر رہے ہیں اور جنوبی افریقہ کے گوروں کے مظالم کو زیادہ وضاحت سے بتانا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک ایسا معاملہ عدالت میں پیش آیا جس میں جج نے یہ فیصلہ دیا کہ جنوبی افریقہ کے قانون میں اسی شادی کا جواز ہے جو عیسائی مذہب کے قاعدے سے ہو۔ یعنی جو بیاہ رجسٹرار کے دفتر میں رجسٹر ہو اس کے علاوہ اور کسی بیاہ کا جواز نہیں ہے۔ اس خوفناک فیصلہ کو سن کر ہندو، مسلمان، پارسی سب کے بیاہ قانون کے خلاف قرار دیئے گئے اور جنوبی افریقہ میں کئی ہندوستانی عورتوں کا درجہ استری کا نہ رہا بلکہ وہ تو باندیاں خیال کی جانے لگیں۔ عورتوں کی اس تذلیل پر کیسے صبر رہ سکتا تھا۔ اب استریوں کو ستیہ آگرہ میں شامل ہونے سے

ہم بالکل روک نہیں سکتے تھے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ انہیں ستیہ آگرہ کی جنگ میں شامل ہونے کے لیے مدعو کیا جائے۔ اس لیے سب سے پہلے ٹالسٹائی آشرم کی استریوں کو ہی دعوت دی گئی وہ خود بھی ستیہ آگرہ کرنے کے لیے تڑپ رہی تھیں۔ ستیہ آگرہ میں پیش ہونے والی تمام مشکلات کی تصویر میں نے ان کے سامنے رکھی۔ کھانا' پینا' لباس' سونا وغیرہ ہر ایک معاملہ کو باوضاحت پیش کیا کہ کس طرح جیل میں مشقت اٹھانی پڑتی ہے اور اہلکاروں سے سخت سست سننا پڑتا ہے۔ مگر ان بہنوں کو تو ان باتوں سے بالکل خوف دکھائی نہ دیا۔ سب کی سب بہادر تھیں۔ ان میں سے ایک تو حاملہ تھی اور کئی بہنوں کی گود میں ننھے ننھے بچے تھے۔ جس طرح نیٹال سے راہداری کے بغیر ٹرانسوال جانا جرم خیال کیا جاتا تھا اسی طرح ٹرانسوال سے نیٹال جانا بھی جرم میں داخل تھا۔ اس لیے فیصلہ ہوا کہ ان لوگوں کو سرحد پار کر کے راہداری کے بغیر لے جا کر ٹرانسوال کی حد میں داخل ہونے کے جرم میں گرفتار کروا دیں۔ اس عرصہ میں جو بہنیں گرفتار کر کے رہا کی گئی تھیں انہیں واپس نیٹال بھیجا جائے۔ اگر انہیں گرفتار کر لیا گیا تو بہتر' ورنہ نیٹال کی کوئلے کی کانوں میں جن کا مرکز نیو کیسل میں تھا چلی جائیں اور وہاں کے مزدوروں کو کانوں کے چھوڑنے کے لیے سمجھائیں۔ وہاں کے مزدور عام طور پر مدراسی علاقہ کے تامل اور تیلگو ہی تھے۔

اس کے بعد میں فینکس پہنچا۔ وہاں میں نے سب کے ساتھ ذکر کیا۔ سب سے پہلے فینکس میں رہنے والی بہنوں سے اس معاملہ میں باتیں کرلی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ بہنوں کو جیل میں روانہ کرنا ایک خوفناک بات ہے۔ فینکس میں رہنے والی کئی بہنیں گجراتی تھیں۔ اس لیے انہیں ٹرانسوال والی بہنوں کی طرح مستعد اور تجربہ کار نہیں کہہ سکتے تھے اور ان میں سے کئی تو میری رشتہ دار ہی تھیں۔ اس لیے ممکن تھا کہ صرف میرے لحاظ سے جیل جانا منظور کر لیں اور اگر عین وقت پر گھبرا کر یا جیل میں جا کر مشکلات سے خائف ہو کر معافی کی طالب ہو جائیں تو مجھے کتنی چوٹ لگے گی اور لڑائی بھی کمزور پڑ جائے گی۔ ان تمام باتوں پر غور کر لینا چاہیے۔ میں نے یہ تو فیصلہ ہی کر لیا تھا کہ اپنی استری کو بالکل تحریک نہیں دوں گا۔ ایک تو وہ کہنے پر انکار نہیں کر سکتی تھی اور اگر اقرار ہی ہو جائے تو یہ یقین نہیں تھا کہ اس کے اقرار کو کس قدر عظمت دی جائے۔ اس حالت میں جو لوگ اپنے آپ کام کریں وہی مفید

رہے گا۔ اس لیے دوسری بہنوں سے میں نے بات چیت شروع کی۔ انہوں نے بھی فوراً ٹرانسوال کی بہنوں کی مانند بیڑا اٹھالیا۔ کہ ہم سب جیل جانے کے لیے تیار ہیں اس کے علاوہ انہوں نے یہ بھی یقین دلایا کہ ہر قسم کے مصائب کو بخوشی برداشت کیا جائے گا۔ میری استری نے بھی یہ باتیں سنیں اس نے مجھے کہا۔

"مجھے دکھ ہے کہ اس معاملہ میں آپ میرے ساتھ بالکل بات چیت تک نہیں کرتے؟ میرے اندر ایسی کون سی کمزوری ہے۔ جس سے میں جیل میں جا نہیں سکتی؟ میں بھی اسی راستہ پر چلنا چاہتی ہوں۔ جس کا آپ ان بہنوں کو مشورہ دے رہے ہیں۔"

میں نے جواب دیا "میں تمہارے دل کو دکھی نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی اس میں کوئی بے اعتمادی کی بات ہے۔ میں تو تمہاری اس بات سے خوش ہوں۔ مگر مجھے ایسی بات بالکل پسند نہیں کہ تم میرے کہنے پر جیل گئی ہو۔ ایسے کام ہر ایک کو اپنی اپنی ہمت سے ہی کرنے چاہئیں۔ اگر میں تمہیں کہوں اور تم میرا حکم مان کر جیل بھی چلی جاؤ مگر عدالت میں تمہارے ہاتھ پاؤں لرزنے لگ جائیں اور ہمت ہار جائے' جیل کی مصیبتیں برداشت نہ کر سکو تو پھر میری کیا حالت ہوگی؟ دنیا میں ہم اپنا سر تک نہیں اٹھا سکیں گے؟"

جواب ملا "اگر میں ہمت ہار کر رہا ہو آؤں تو آپ مجھے سو بکار نہ کرنا۔ آپ یہ کس طرح خیال کر سکتے ہیں کہ آپ اور ہمارے بچے تو تکلیف برداشت کریں' مگر اکیلے میں نہیں برداشت نہ کر سکوں؟ مجھے تو آپ کو اس جنگ میں شامل کرنا پڑے گا۔"

میں نے جواب دیا "تب تو مجھے آپ کو شامل کرنا ہی پڑے گا۔ تم میری شرط کو تو جانتی ہی ہو اور میری عادت سے بھی واقف ہو۔ اب بھی سوچنا ہو تو سوچ لو۔ اگر سوچنے کے بعد یہ جان لو کہ یہ کام نہیں ہو سکے گا تو تمہیں چھٹی ہے۔ قدم بڑھانے سے پہلے اپنا فیصلہ بدلنے میں شرم کی کوئی بات نہیں ہے۔"

اس نے کہا "مجھے کوئی سوچ بچار کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے فیصلہ پر اٹل ہوں۔"

فینکس میں اور لوگ بھی رہتے تھے۔ انہیں بھی میں نے اس سوال پر آزادانہ طور پر غور کرنے کے لیے کہا۔ جنگ جلد ختم ہو یا دیر بعد فینکس بنا رہے یا برباد ہو جائے۔ جانے والے چلے جائیں یا بیمار ہو جائیں لیکن کسی کو منہ نہیں موڑنا چاہیے۔ اس قسم کی شرائط میں نے

بار بار اچھی طرح سمجھا دیں اور سب لوگ تیار ہو گئے۔ فینکس سے باہر والوں میں صرف رستم جی پارسی ہی تھے۔ انہیں تمام لوگ محبت سے کاکا جی کہتے تھے۔ میں ان سے یہ باتیں در پردہ نہیں رکھ سکتا تھا اور نہ وہ پیچھے رہ سکتے تھے۔ پہلے ستیہ آ گرہ میں بھی وہ جیل جا چکے تھے اور اب دوسری بار بھی تیار ہو گئے تھے۔

ہم نے جیسا سوچا تھا۔ ویسا ہی ہوا۔ جو بہنیں ٹرانسوال میں گرفتار نہ ہو سکیں وہ مایوس ہو کر اب نیٹال آ ئیں۔ مگر پولیس نے انہیں گرفتار نہ کیا۔ اس لیے وہ نیو کیسل چلی گئیں اور وہاں جا کر انہوں نے اپنا کام شروع کر دیا جس کا اثر بجلی کی طرح ہوا اور تین پونڈ جزیہ کی بات کا ان پر بڑا اثر ہو پڑا اور مزدوروں نے اپنا کام چھوڑ دیا۔

بھلا اب سرکار ان بہادر بہنوں کو کیسے چھوڑ سکتی تھی۔ انہیں گرفتار کر کے تین تین ماہ کی سزا دی گئی۔

☆☆☆

باب نمبر ۳۷

بہنوں کا حصہ - ۲

عورتوں کی بہادری کا ذکر بیان کرنا آسان نہیں ہے۔ انہیں نیٹال کی راجدھانی میر نسبرگ کے جیل میں رکھا گیا اور اچھی تکلیف دی گئی۔ کھانے پینے کا ذرا بھی خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔

انہیں دھوبی کا کام دیا گیا۔ باہر سے کھانا منگوانے کی مخالفت تھی جو آخری دم تک باقی رہی۔ کستورا بائی ایک خاص قسم کی خوراک کا برت لئے ہوئے تھی۔ اہلکاروں نے بڑی مشکل سے انہیں وہ خوراک دینا منظور کیا مگر اس کے باوجود ایسی خوراک تھی جو کھانے کے قابل نہیں تھی۔ زیتون کے تیل کی بالخصوص ضرورت رہا کرتی تھی۔ ابتدا میں تو وہ دیا ہی نہیں جاتا تھا۔ اور جب دینے لگے تو پرانا اور سخت خراب تیل دیا جانے لگا مگر جب یہ درخواست دی گئی کہ ہمارے ذاتی خرچ سے ہی کھانا منگوایا جائے تو جواب ملا کہ یہ ہوٹل نہیں جیل ہے۔ جو ملے گا کھانا پڑے گا۔ وہ جیل سے رہا ہوئیں تو جسم میں ہڈیاں ہی نظر آتی تھیں۔

ایک دوسری بہن خطرناک بخار لے آئی۔ جس سے تھوڑے عرصہ بعد ہی وہ ملک عدم کو کوچ کر گئی۔ میں اس واقعہ کو بھول نہیں سکتا تھا۔ بالی اماں منوسوامی مدلیار ۱۶ برس کی لڑکی تھی۔ جب میں اس کے قریب پہنچا تو وہ بستر سے اٹھ تک نہیں سکتی تھی۔ چونکہ طویل القامت تھی اس لیے اس کی صورت از حد خوفناک نظر آتی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”بالی اماں! جیل جانے کا رنج تو نہیں ہے؟“

وہ بولی ”افسوس کیسا؟ اگر دوبارہ گرفتار کریں تو اسی وقت جانے کے لیے تیار ہوں۔“

”لیکن اس حالت میں اگر موت آجائے تو؟“

”بے شک آجائے وطن کے لیے کون مرنے سے انکار کرتا ہے۔“

مگر اس کے تھوڑے عرصہ بعد بالی اماں چل بسی۔ اگرچہ وہ ہم سے جدا ہوگئی۔ مگر اس کی یاد دلوں میں ابھی تک کارفرما ہے۔ ان کی قربانی اور جیل جانا سچی قربانی تھی۔ ایسی نیک دعائیں بھگوان خود سنتے ہیں اور قربانی کی پاکیزگی میں ہی کامیابی پنہاں ہے۔ بھگوان تو بھاونا کے بھوکے ہیں۔ اس لیے اغراض سے بالا استدعا کرتے ہوئے پانی اور پتے تک قبول کر لیتے ہیں۔ اسے وہ بڑی محبت سے قبول کر کے اس کا کروڑوں گنا اجر دیتے ہیں اور سداماں کے مٹھی بھر چاولوں کے عوض میں اس کی برسوں کی بھوک مٹا دیتے ہیں۔ بے شمار لوگوں کے جیل جانے سے اگرچہ کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو مگر ایک بھی نیک آتما کی دعا کسی وقت ناکام نہیں ہوسکتی۔ کون کہتا ہے کہ جنوبی افریقہ میں کس کس کا یگیہ سپھل ہوا۔ مگر ہم اس قدر ضرور جانتے ہیں کہ بالی اماں کی قربانی ضرور سپھل رہی۔

وطن اور دنیا کے یگیہ میں لاتعداد روحیں قربان ہوئیں، ہو رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ اس حقیقت سے سب جانکار ہیں مگر ستیہ آگرہی یہ ضرور جانتے ہیں کہ ان میں سے اگر ایک روح بھی پاک ہوگی تو اس کی قربانی کافی ہے۔ دنیا ستیہ پر قائم ہے۔ نیستی پر نہیں۔ ستیہ کو ہست کہتے ہیں اور جہاں نیستی ہے وہاں کامیابی کیسے ہوسکتی ہے اور جو ہست ہے اس کو کون تباہ کرسکتا ہے۔ بس اسی میں ستیہ آگرہ کا عقیدہ مضمر ہے۔

☆☆☆

باب نمبر ۳۸

مزدور بھی

عورتوں کی گرفتاریوں کا مزدوروں پر عجیب اثر ہوا۔ نیوکیسل کے قریب ہی کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں نے اپنے اوزار پھینک دیئے اور کافی تعداد میں شہر میں آنے لگے۔ اس خبر کے ملتے ہی، میں فینکس چھوڑ کر نیوکیسل میں پہنچا۔

ایسے مزدوروں کے اپنے مکان نہیں ہوتے۔ مالک ہی ان کے جھونپڑے بنواتے ہیں اور روشنی اور پانی کا انتظام کرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ مزدور ہر لحاظ سے ان کے آسرا پر ہوتے ہیں۔

یہ ہڑتالی مزدور میرے پاس کئی قسم کی شکایات لے کر آنے لگے۔ کوئی کہتا کہ کارخانہ کے مالکوں نے راستہ کی بتیوں کو ہٹا دیا ہے۔ کوئی کہتا پانی بند کر ڈالا ہے۔ کوئی کہتا وہ ہڑتالیوں کا اسباب جھونپڑوں سے باہر پھینک رہے ہیں۔ ایک پٹھان بھائی سید ابراہیم نے مجھے اپنی پیٹھ دکھا کر کہا۔

”یہ دیکھئے مجھے کیسے مارا ہے۔ صرف آپ کی خاطر میں نے اس بدمعاش کو چھوڑ دیا کیونکہ یہ آپ کا ایسا حکم نہیں تھا۔ نہیں تو میں پٹھان ہوں ہم مرنا جانتے ہیں۔“

میں نے جواب دیا ”تم نے بہت اچھا کام کیا۔ میں اسی کام کو سچی بہادری سمجھتا ہوں۔ ہم لوگ تمہارے بل پر ہی کامیاب ہوں گے۔“

مزدور سینکڑوں کی تعداد میں تھے۔ ہزاروں میں بھی کوئی کسر نہ ہوگی۔ میں بھلا ان کے لیے مکان کہاں سے لاتا؟ اور خوراک کا کیسے انتظام کرتا اور اتنے کثیر التعداد افراد کو ایک

ہی مقام پر بلا مطلب رکھنا ضرور خطرناک تھا۔

مجھے آخر کار ایک تدبیر سوجھی کہ انہیں بھی فینکس کے لوگوں کی مانند ٹرانسوال لے جا کر کیوں نہ جیل میں بٹھا دوں؟ کوئی پانچ ہزار آدمی اکٹھے ہو گئے۔ انہیں ٹرین کے ذریعہ نہیں لے جا سکتا تھا۔ اتنی رقم کہاں سے آتی۔ اس طرح لوگوں کی آزمائش تک نہیں ہو سکتی تھیں۔ نیو کیسل سے ٹرانسوال کی حدود چھتیس میل تھی۔ نیٹال کا سرحدی گاؤں چارلس ٹاؤن تھا اور ٹرانسوال کا بوکس رسٹ، مزدوروں سے مشورہ لیا گیا۔ پیدل سفر کا فیصلہ ہوا۔ ان لوگوں میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ جن میں سے کئی لیت و لیل کر گئے۔ میرے پاس دل کو پختہ کرنے کے علاوہ اور کوئی تدبیر نہیں تھی۔ میں نے انہیں کہہ دیا جو واپس کام پر جانا چاہیں وہ جا سکتے ہیں۔ مگر واپس جانے کے لیے کوئی آدمی تیار نہیں تھا۔ مگر جو لوگ اپاہج تھے۔ انہیں ٹرین سے سفر کے لیے تیار کیا گیا اور باقی سب چارلس ٹاؤن تک پیدل جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ دو دنوں میں راستہ طے کرنا تھا۔ آخر کار سب لوگ خوش ہو گئے۔ نیو کیسل کے گوروں کو ہیضہ سے خوف تھا۔ اس لیے وہ جو کچھ کرنے والے تھے۔ اس سے انہیں مخلصی ہو گئی اور ہم بھی ان کے انتظامات کی تکلیف سے بچ گئے۔

ابھی چلنے کی تیاری میں ہی تھے کہ کارخانہ داروں کا پیغام آ پہنچا۔ اس لیے میں ڈربن پہنچا۔ وہ لوگ یہ تسلیم نہیں کرتے تھے کہ تین پونڈ جزیہ کا کانوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں انہیں اس بات پر راضی نہ کر سکا کہ اس ٹیکس کو ہٹانے کے لیے کہ وہ حکومت سے مستدعی ہو سکیں۔ اس کے بعد میں نیو کیسل واپس آیا۔ چاروں طرف سے مزدور بڑھتے آ رہے تھے۔ میں نے انہیں تمام باتیں اچھی طرح سمجھا دیں اور یہ بھی کہہ دیا کہ اگر آپ واپس جانا چاہتے ہیں تو اب بھی جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ کارخانہ داروں کے رعب وغیرہ کا ذکر بھی کیا اور مستقبل میں آنے والی تکلیفات کو بھی بیان کیا اور محتاط کر ڈالا کہ لڑائی کب ختم ہو گی، جیل کی تکلیفوں کو واضح کر کے بیان کر ڈالا۔ مگر وہ اپنے ارادہ سے متزلزل نہ ہوئے اور بولے آپ جب تک لڑائی کے لیے تیار ہیں اس وقت تک ہم بھی اپنا قدم پیچھے نہیں ہٹائیں گے۔ آپ ہماری فکر مت کریں۔ ہمیں سب باتوں کا خیال ہے۔

اس وقت تو صرف کوچ ہی باقی رہ گیا تھا۔ ایک دن شام کو میں نے مزدوروں کو خبر

دی کہ اگلے دن ۲۰/۱ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو علی الصبح چلنا ہے اور یہ بھی سمجھا دیا کہ راستہ میں چلتے ہوئے کن پابندیوں پر عمل کرنا پڑے گا۔ پانچ چھ ہزار کے جھنڈ کو سمجھا کر رکھنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ راستہ میں ڈیڑھ پونڈ روٹی اور نصف چھٹانک شکر کے علاوہ اور کچھ نہیں ملے گا۔ علاوہ بریں اگر راستہ میں ہندوستانی بیوپاریوں سے کچھ مل گیا تو لے لیں گے لیکن اگر ایسا موقعہ نہ ملا تو اتنے پر ہی اکتفا کرنا پڑے گا۔ بوئیر کی جنگ اور جلو بغاوت کے تجربات نے مجھے اچھا فائدہ پہنچایا۔ یہ شرط بھی تھی کہ کوئی آدمی ضرورت سے زاید کپڑے تک نہیں لے جا سکتا۔ راستہ میں انگریز حاکم لوگ ملیں تو باوجود ان کے سخت سست کہنے کے برداشت سے کام لینا ہو گا اور اگر پولیس قید کرنا چاہے تو عذر نہیں کرنا اور اگر مجھے گرفتار کر لیا جائے پھر بھی اسی طرح چلتے جائیں۔ اس کے علاوہ انہیں یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ میرے بعد متواتر کون کون آدمی میری جگہ کام جاری رکھیں گے۔

سب لوگ سمجھ گئے اور ہمارا جتھا صحیح سلامت چارلس ٹاؤن میں جا پہنچا۔ یہاں بیوپاریوں نے خوب مدد دی اور اپنے مکانات ٹھہرنے کے لیے کھول دیئے اور مسجد کے احاطہ میں رسوئی تیار کرنے کی سہولت بہم پہنچائی۔ سفر کی خوراک ختم ہو گئی تھی۔ چارلس ٹاؤن میں ہمیں کچھ دن ٹھہرنا پڑا۔ اس لیے ہمیں رسوئی کے برتنوں کی ضرورت پڑی۔ بیوپاریوں نے بخوشی سب مہیا کر دیئے۔ چاول وغیرہ ہمارے پاس پہلے ہی کافی تھے۔ مگر اس کے باوجود بیوپاریوں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

چارلس ٹاؤن ایک چھوٹا گاؤں تھا۔ اس زمانہ میں بمشکل وہاں کی آبادی ایک ہزار کے لگ بھگ ہو گی۔ اس لیے اس میں اتنے ہزار آدمیوں کا سما جانا مشکل تھا چنانچہ بچوں اور استریوں کو مکانوں کے اندر رکھا گیا اور باقی سب کھلے میدان میں ٹھہرے۔

ان لوگوں سے پاکیزگی کے قواعد پر عمل کرانا بڑا مشکل تھا۔ مگر میرے ساتھیوں نے اس کام کو آسان کر ڈالا اور یہ میرا پرانا تجربہ ہے کہ اگر لیڈر خدمت گاری کا کام شروع کر دیں اور حکم دینے کی بجائے خود سیوا پر ڈٹ جائیں تو کافی کام ہو سکتا ہے۔ اگر لیڈر اپنے آپ کو ذرا بھی تکلیف میں ڈالے گا تو دوسرے لوگ اس کی تقلید کریں گے۔ کم از کم مجھے اس موقعہ پر تجربہ ہوا۔ میں اور میرے ساتھی صفائی وغیرہ کے کام سے بالکل جھجکتے نہیں تھے۔ اس

لیے دوسرے لوگ ان کاموں کو بڑی عزت سے کرنے لگ جاتے تھے۔ یعنی اگر ہم خود اپنے ہاتھوں سے کام نہیں لے سکتے تو صرف حکم دینے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور اگر تمام لوگ لیڈر بن کر دوسروں پر حکم چلانے لگ جائیں تو کسی کام کا پایہ تکمیل تک پہنچنا آسان نہیں ہے۔ مگر جہاں لیڈر خود سیوک بن جاتے ہیں وہاں دوسرے لوگ لیڈری کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ کھانے میں دال اور بھات دیا جاتا تھا۔ سبزی بھی اچھی ملتی تھی۔ لیکن اسے علیٰحدہ علیٰحدہ پکانے کے لیے اتنے برتن نہیں تھے اور اتنی فرصت بھی نہیں تھی۔ اس لیے ساگ دال کے ساتھ ملا دیا جاتا۔ چوبیس گھنٹے کھانا پکتا رہتا کیونکہ لوگ دن رات آتے ہی رہتے تھے۔ نیو کیسل میں کسی مزدور کے ٹھہرانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہر ایک کو راستہ کا پتہ تھا۔ اس لیے ہر ایک شخص کان سے نکلتے ہی سیدھا چارلس ٹاؤن آ جاتا۔

جب میں لوگوں کے صبر اور برداشت پر غور کرتا ہوں تو میرے سامنے پرماتما کی عظمت روشن ہو جاتی ہے۔ کھانا پکانے والوں میں کٹیکا تھا۔ کسی دن دال میں پانی زیادہ ہو جاتا اور کبھی وہ گلتی ہی نہیں تھی۔ کبھی ساگ کچا رہتا اور کبھی بھات بگڑ جاتا تھا۔ میں نے دنیا میں ایسے بہت کم لوگ دیکھے ہیں جو اس قسم کا کھانا کھائیں۔ اس کے علاوہ جنوبی افریقہ کی جیل میں 'میں نے یہ دیکھا کہ کم مقررہ خوراک سے کم وبیش کچا کھانا ملنے پر اچھے اچھے لوگوں کا مزاج بھی بگڑ جاتا تھا۔

کھانا تیار کرنے سے پروسنے کا کام زیادہ مشکل تھا۔ یہ تو بالکل میرے ہی سپرد تھا۔ اور کچے پکے کھانے کا جواب وہ بھی میں ہی تھا۔ گاہے ماہے کھانے والے زیادہ ہو جاتے اور خوراک کم ہو جاتی تھی۔ ایسے موقعوں پر تھوڑی بچت سے کام لیا جاتا اور لوگوں کو سمجھنا بھی پڑتا تھا۔ کم خوراک ملنے پر بہنیں میری طرف معترضانہ ڈھنگ سے دیکھتی تھیں اور میری مجبوری کو دیکھ کر مسکرانے لگ جاتی تھیں۔ مجھے زندگی میں وہ واقعات بالکل نہیں بھول سکتے۔ میں کہتا تھا۔ لاچار ہوں' میرے پاس پکی ہوئی خوراک کم ہے اور کھانے والے بڑھ گئے ہیں۔ اسی لیے اب مجھے اسی طرح کام کرنا چاہیے تاکہ تھوڑا تھوڑا سب کو مل جائے۔ یہ سنتے ہی وہ صبر کر کے رہ جاتے ہیں۔

☆☆☆

باب نمبر ۳۹

ہمارا کوچ-۱

اب چارلس ٹاؤن چھوڑنے کا وقت آ پہنچا تھا۔ میں نے حکومت کو لکھ دیا تھا کہ ہم ٹرانسوال آباد ہونے کے خیال سے داخل نہیں ہونا چاہتے۔ بلکہ ہم تو وہ فریاد لے کر آئے ہیں جو حکومت کی وعدہ خلافی سے حکومت کے خلاف کرنی پڑی ہے اور ہم صرف یہ اقدام اسی لیے کرنے لگے ہیں کیونکہ ہماری روح کو آپ کے طرزِ عمل سے گہری چوٹ پہنچی ہے۔ اگر آپ ہمیں یہاں چارلس ٹاؤن میں ہی گرفتار کر لیں گے تو ہمیں کوئی زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی اور اگر آپ ایسا نہیں کریں گے اور ہم ایسے ہی ٹرانسوال میں داخل ہو جائیں گے۔ تو اس کے لیے ہم جوابدہ نہیں ہوں گے۔ اس کے علاوہ ہماری جنگ میں کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے۔ اور نہ کسی کی ذاتی غرض کارفرما ہے اور اگر کوئی چھپ کر ٹرانسوال میں داخل ہوگا تو وہ ہمیں اچھا نہیں لگے گا۔ یہاں محبت کے علاوہ ہزاروں آدمیوں سے کام لینے کی اور کوئی تدبیر نہیں ہے۔ وہاں ہم کسی کام کے لیے ذمہ دار نہیں ہو سکتے اور اس کے علاوہ آپ یہ بھی جان لیں کہ اگر آپ تین پونڈ کا جزیہ نہ لیں تو تمام گرمٹیا اپنے کام پر دوبارہ حاضر ہو جائیں گے اور ہڑتال ختم ہو جائے گی اور ہندوستانیوں کی دیگر تکلیفات کے دور کرنے کے لیے انہیں اپنے ستیہ آگرہ میں شامل نہیں کریں گے۔

اس خط کی وجہ سے حالات کافی حد تک بہتر ہو گئے اور یہ پتہ نہیں تھا کہ حکومت کب ہمیں گرفتار کر لیتی ہے۔ مگر ان حالات میں حکومت کے جواب کے لیے زیادہ انتظار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے ہم نے ارادہ کر لیا کہ اگر حکومت ہمیں یہاں گرفتار نہیں کرے گی تو

ہم ٹرانسوال میں داخل ہو جائیں گے اور اگر راستہ میں بھی ہم گرفتار نہ ہوئے تو بیس چوبیس میل روزانہ کا سفر ایک ہفتہ میں طے ہوسکتا ہے۔ آٹھ دن میں ٹالسٹائی آشرم پر پہنچنا ہے اور یہ بھی سوچ لیا تھا کہ بعد میں جنگ کے اختتام تک ہم سب وہاں ہیں اور کام کر کے روزی پیدا کریں گے۔ مسٹر کیلن بیک نے سارا انتظام کر رکھا تھا اور ان یاتریوں سے ہی وہاں مٹی کے مکان تیار کروانے کا فیصلہ ہوگیا تھا۔ اس سے قبل چھوٹے ڈیرے بنا کر بوڑھے اور کمزور آدمیوں کو وہاں رکھنے کا خیال تھا کیونکہ طاقتور لوگ تو باہر بھی رہ سکتے تھے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ بارش کا موسم آنے والا تھا۔ اس لیے برسات میں سب کے لیے آسرا کی ضرورت تھی۔ مگر مسٹر کیلن بیک کو یقین تھا کہ اتنے عرصہ میں یہ معاملہ سلجھ جائے گا۔

کوچ کی اور بھی تیاریاں کی گئیں۔ چارلس ٹاؤن کے ڈاکٹر برسکو بڑے نیک آدمی تھے۔ وہ بڑی ہمدردی سے پیش آیا کرتے تھے۔ انہوں نے ایسی ادویات کا ایک بکس مجھے دیا جو راستہ میں کام آ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اور کئی ایسے اوزار بھی دیئے جن کے ذریعہ میرے جیسا آدمی بھی کام لے سکتا ہے۔ ہم وہ بکس خود اٹھا کر لے جاتے تھے۔ کیونکہ ہمارے جتھہ کے ساتھ کوئی سواری وغیرہ نہیں تھی۔ اس لیے ہم نے صرف اتنی ادویات ہی اپنے پاس رکھیں جو قریباً سو آدمیوں کے لیے کافی ہوسکتی تھیں۔ ہمیں کوئی مشکل پیش نہ آئی کیونکہ ہمیں روزانہ کسی نہ کسی گاؤں کے پاس ہی شام آ جاتی تھی اور دوائیوں کے ختم ہونے پر اور دوائیاں دستیاب ہو جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ ہم اپنے ہمراہ ایک بھی کمزور اور مریض نہیں رکھتے تھے بلکہ ایسے آدمیوں کو راستہ میں ہی چھوڑ جاتے تھے۔

کھانے کے لیے ڈبل روٹی اور شکر کے علاوہ اور کیا مل سکتا تھا؟ مگر ڈبل روٹی ہم ایک ہفتہ تک کس طرح رکھ سکتے تھے۔ وہ تو روزانہ تقسیم کر دی جاتی تھی۔ اس کی تدبیر تو یہ تھی کہ روزانہ ہمیں ہر ایک منزل پر ڈبل روٹیاں مل جایا کریں۔ مگر ایسا کون کرتا؟ ہندوستانی باورچی تو وہاں تھے نہیں اور ہر ایک گاؤں میں ڈبل روٹیاں تیار کرنے والے بھی نہیں تھے۔ دیہات میں تو شہروں سے روٹیاں جایا کرتی تھیں اور اگر باورچی متواتر روٹیاں تیار کر دیں اور ریل کے ذریعہ وقت پر پہنچ جاتیں تو یہ ممکن تھا۔ چارلس ٹاؤن سے بارکس ریسٹ دگنا گاؤں تھا۔ وہاں ڈبل روٹیاں تیار کرنے والی ایک بڑی دکان تھی۔ اس نے بڑی خوشی سے

روٹیاں مہیا کرنے کا کام اپنے ذمہ لے لیا۔ اور ہماری مشکلات کو مدنظر رکھ کر مقررہ داموں سے زاید نہ لیا۔ روٹیاں اچھی ہوا کرتی تھیں اور دکان کا مالک مقررہ وقت پر گاڑی سے پہنچا دیا کرتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس معاملہ میں وہ کافی احتیاط سے کام لیا کرتا تھا۔ انہوں نے ہمارے لیے بے شمار سہولتیں مہیا کر ڈالیں۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ہمارا کسی سے عناد نہیں ہے اور نہ ہم کسی کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ ہمیں تو تکلیف برداشت کر کے ظلم کے خلاف آواز بلند کرنی تھی۔ اس لیے ہمارے اردگرد کا کرہ ہوائی بھی شدھ ہو رہا تھا۔ سب لوگ خلوص سے پیش آئے اور ہر ایک نے یہ محسوس کیا کہ ہم سب عیسائی' پارسی' مسلمان اور یہودی وغیرہ بھائی بھائی ہیں۔ اسی طرح کوچ کے دوران میں ایک بار پھر میں نے سمجھوتے کی کوشش کی۔ تار اور خط وغیرہ تو بھیج ہی چکا تھا۔ اب میں نے ٹیلی فون پر جنرل سمٹس سے بات چیت کی اور نصف منٹ میں جواب ملا۔ جنرل سمٹس آپ سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتے۔ جو جی میں آئے کیجئے۔

اس کے بعد ٹیلی فون بند ہوگیا۔ یہ کوئی ناممکن بات نہیں تھی۔ اگرچہ مجھے اتنے شک پن کی امید نہیں تھی۔ دوسرے دن ۶/ نومبر ۱۹۱۳ء کو مقررہ وقت پر ساڑھے چھ بجے صبح ہم نے پرارتھنا کی اور ایشور کا نام لے کر چل پڑے۔ اس وقت کوچ میں ہمارے ساتھ دو ہزار سینتیس (۲۰۳۷) آدمی' ایک سو ستائیس (۲۱۵۷) عورتیں اور ستاون (۵۷) بچے تھے۔

☆☆☆

باب نمبر ۴۰

ہمارا کوچ-۲

چارلس ٹاؤن سے ایک میل پر بوکس رسٹ کا جھرنا تھا۔ اس کے پار کرتے ہی ٹرانسوال میں پہنچ جاتے ہیں۔ اس جھرنے کے اس پار گھڑ سوار پولیس کھڑی تھی۔ سب سے پہلے میں ان کے پاس پہنچا اور جتھے کو سمجھا دیا تھا کہ جس وقت میں اشارہ کروں وہ فوراً جھرنا پار کرلیں۔ مگر ابھی میں پولیس سے بات چیت کر رہا تھا کہ لوگ آگے بڑھ آئے اور جھرنے کو پار کرلیا۔ گھڑ سوار ان کے سامنے کھڑے ہو گئے مگر وہ جتھا اس طرح رکنے والا نہیں تھا۔ پولیس ہمیں گرفتار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں نے لوگوں کو خاموش کیا اور سمجھایا کہ وہ قطار بنا کر چلیں۔ پانچ سات منٹ میں خاموشی طاری ہوگئی اور اب ٹرانسوال میں کوچ شروع ہوگیا۔

بوکس رسٹ کے گوروں نے دو دن پہلے جلسہ کیا تھا اور ہمیں کئی قسم کی دھمکیاں دی تھیں اور کئی مقرروں نے یہاں تک کہا تھا کہ اگر ہندوستانی ٹرانسوال میں داخل ہوں گے تو ہم ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کریں گے۔ اس جلسہ میں مسٹر کیلن بیک گوروں کو سمجھانے کے لیے گئے تھے مگر کوئی ان کی بات سننا ہی نہیں چاہتا تھا۔

اس جلسہ کی خبر ہمیں مل چکی تھی اور ہم ہر طرح سے تیار تھے۔ پولیس کی کافی جمعیت بلانے کا یہ بھی مطلب تھا کہ گوروں کو اودھم مچانے سے روکا جائے۔ جیسا بھی ہو ہمارا جلوس بڑے امن سے اپنے مقام پر جا پہنچا۔ مجھے یاد ہے کہ کسی گورے نے ذرا بھی طوفان بپا نہ کیا۔ سب کے سب اس نئے جلوس کو دیکھنے کے لیے باہر نکل آئے تھے۔ ان میں سے کئی ایک کی آنکھوں سے دوستی کے احساسات نمایاں ہو رہے تھے۔

ہمارا پہلا پڑاؤ مفورٹ تھا جو بوکس رسٹ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر تھا۔ ہم وہاں شام کے پانچ بجے کے قریب پہنچے۔ روٹی اور شکر کھا کر سب لوگ کھلی ہوا میں لیٹے ہوئے تھے۔ کوئی بھجن گا رہا تھا تو کوئی بات چیت میں مصروف تھا۔ کئی عورتیں تھک کر چور ہوگئی تھیں کیونکہ اپنے بچوں کو گود میں لے کر انہوں نے چلنے کی کوشش کی تھی۔ مگر اب ان کے لیے قدم اٹھانا دوبھر معلوم ہو رہا تھا۔ اس لیے میں نے اپنی تحریک کے مطابق انہیں ایک دکان پر چھوڑ دیا تاکہ اگر ہم ٹالسٹائی آشرم پر پہنچ جائیں تو وہ انہیں وہاں بھیج دیں اور گرفتار ہو جائیں تو انہیں گھر بھیج دیں۔

جوں جوں رات آتی جاتی تھی۔ سکون غالب آتا جاتا تھا۔ میں بھی آرام کی تیاری کر رہا تھا کہ اتنے میں کوئی آواز سنائی دی۔ میں نے ایک پولیس افسر کو لیمپ ہاتھ میں لیے دیکھا۔ میں اس کا مطلب سمجھ گیا کوئی تیاری تو کرنی ہی نہیں تھی۔ پولیس افسر نے آتے ہی کہا:

”میرے پاس آپ کا وارنٹ ہے۔ میں نے آپ کو گرفتار کرنا ہے۔“

میں نے پوچھا ”کب؟“

وہ بولا ”ابھی۔“

میں نے کہا ”پھر مجھے لے چلیے۔“

ابھی اس قریبی سٹیشن پر گاڑی ملتے ہی بوکس رسٹ۔

میں نے اسے کہا ”پھر تو میں کسی کو بیدار کیے بغیر ہی آپ کے ساتھ چل دیتا ہوں۔ اچھا اپنے ایک ساتھی کو ذرا سمجھا دوں؟“

وہ بولا ”شوق سے سمجھائیے۔“

میں نے قریب ہی سوئے ہوئے پی کے نیڈو کو بیدار کیا اور انہیں اپنی گرفتاری کا ذکر سنایا اور کہا کہ لوگوں کو صبح ہونے سے پہلے بیدار نہ کیا جائے۔ صبح ہوتے ہی طلوع آفتاب سے قبل کوچ کر دیا جائے اور جہاں آرام کرنے اور روٹی بنانے کا وقت ملے وہاں انہیں میری گرفتاری کی خبر سنا دیں اور اس عرصہ میں جو کچھ دریافت کریں بتا دیا جائے اور اگر سرکار جتھے کو گرفتار کرنا چاہے تو گرفتار ہو جائیں۔ اور گرفتار نہ کیا جائے تو جتھا مقرر طریقہ سے کوچ

کرتا جائے۔ نیڈو کو کسی قسم کا خوف تو تھا نہیں۔ انہیں یہ بھی سمجھا دیا گیا کہ اگر وہ خود گرفتار ہو جائیں تو انہیں کیا کرنا چاہیے۔ بوکس رسٹ میں مسٹر کیلن بیک کی ٹرین پر سوار ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر عدالت میں مقدمہ پیش ہوا۔ سرکاری وکیل نے تاریخ بڑھانے کی درخواست دی کیونکہ اس کے پاس کوئی ثبوت تیار نہیں تھا۔ اس لیے تاریخ بڑھا دی گئی۔ میں نے ضمانت کی درخواست پیش کی اور وجہ بتائی کہ میرے پاس دو ہزار مرد ۱۲۲ عورتوں اور پچاس بچوں کا جتھا ہے۔ اگلی پیشی تک میں انہیں مقررہ مقام پر پہنچا کر حاضر ہو جاؤں گا۔ مگر سرکاری وکیل نے اس کی مخالفت کی۔ مجسٹریٹ لاچار تھا کیونکہ مجھ پر جو الزام عاید کیا گیا تھا۔ وہ ایسا نہیں تھا جس میں ضمانت لی جا سکے۔ اس نے پچاس پونڈ کا مچلکہ لے کر مجھے رہا کر دیا۔ مسٹر کیلن بیک نے میرے لیے موٹر تیار رکھی تھی۔ اس لیے میں فوراً اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا اور ہم پھر آگے بڑھے مگر مجھے آزاد چھوڑ کر سرکار کو کیسے چین مل سکتا تھا۔ اس لیے میں آٹھ تاریخ کو دوبارہ سٹینڈرٹن میں گرفتار کر لیا گیا۔ بہ نسبت دیگر مقامات کے یہ جگہ کچھ بڑی ہے۔ یہاں بڑے عجیب ڈھنگ سے مجھے گرفتار کیا گیا۔ اس وقت میں لوگوں میں روٹیاں تقسیم کر رہا تھا۔ یہاں کے دکانداروں نے ہمیں مربوں کے چند ڈبے دیئے تھے۔ ان کی تقسیم میں اس دن کافی وقت خرچ آیا۔ اسی اثناء میں مجسٹریٹ میرے پاس آ کھڑا ہو گیا۔ روٹیاں وغیرہ تقسیم کرنے کے فوراً بعد ہی مجھے ایک طرف بلایا۔ میں نے خیال کیا تھا کہ شاید وہ کوئی بات کہنا چاہتا ہے لیکن اس نے مجھے ہنس کر کہا۔

''آپ میرے قیدی ہیں۔''

میں نے کہا ''پھر تو میرا درجہ بڑھ گیا۔ پولیس کی بجائے آپ کو میری گرفتاری کے لیے آنا پڑا۔ مگر مجھ پر ابھی مقدمہ تو نہیں چلائیں گے؟''

وہ بولے ''میرے ساتھ ہی چلئے۔ عدالت کی کارروائی جاری ہے۔''

لوگوں کو کوچ جاری رکھنے کی ہدایت کر کے میں ان کے ہمراہ چل دیا۔ جب میں عدالت کے کمرہ میں پہنچا تو اپنے چند ایک اور ساتھیوں کو بھی گرفتار پایا۔

جس وقت مجھے عدالت کے سامنے کھڑا کیا گیا۔ میں نے رہائی کے لیے وہی وجوہات پیش کیں جو بوکس رسٹ میں دی تھیں۔ یہاں بھی سرکاری وکیل نے مخالفت کی اور

پچاس پونڈ کی ضمانت پر مجھے ۲۱ تاریخ تک کے لیے رہا کر دیا گیا۔

بیوپاری لوگوں نے میرے لیے گاڑی تیار ہی کر رکھی تھی۔ ہمارا جتھا ابھی تین میل بھی نہیں گیا تھا کہ میں پھر اس میں جا ملا۔ اس بار ہم لوگوں نے خیال کیا کہ شاید اب ہم ٹالسٹائی کے آشرم تک پہنچ جائیں گے مگر یہ اندازہ غلط نکلا۔ لوگ میری گرفتاری کے عادی ہو گئے تھے۔ مگر میرے پانچ ساتھی تو جیل میں ہی رہے۔ اب ہم جوہانسبرگ کے قریب پہنچ رہے تھے۔ سارا سفر آٹھ دن میں طے کرنے کا پہلے ہی فیصلہ کیا ہوا تھا۔ اب تک ہم مقررہ پروگرام کے مطابق سفر کرتے آ رہے تھے اور ابھی پوری چار منزلیں باقی تھیں۔ مگر جیسے ہی ہمارا حوصلہ بڑھتا جاتا تھا۔ حکومت کی پریشانی بڑھتی جاتی تھی۔ یعنی اس ہندوستانی حملہ کی کیسے روک تھام کی جائے۔ اگر منزل طے کرنے پر حکومت ہمیں گرفتار کرتی تو اس سے اس کی کمزوری اور بدانتظامی آشکارا ہو جاتی۔ اس لیے اس نے شاید سوچا کہ اگر گرفتار ہی کرنا ہے تو منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی کیوں نہ گرفتار کیا جائے۔

اسی وقت گوکھلے کا ایک تار ملا کہ مسٹر ہنیری پولک جو فنیکس میں ہمارے ساتھ رہتے تھے۔ ہندوستان پہنچ کر ہندوستانی حکومت اور برٹش سرکار کے سامنے وہاں کی حقیقی حالت پیش کرنے میں میری مدد کریں۔ اس لیے ہم نے انہیں ہندوستان بھیجنے کی تیاری کی۔ میں نے انہیں جانے کے لیے لکھا مگر وہ ہندوستان جانے سے پہلے تمام حالات مجھ سے معلوم کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے انہیں تار کے ذریعہ ہی جواب دیا کہ ''گرفتاری کی تکلیف اٹھانا چاہیں تو آ جائیں۔''

تکلیف برداشت کرتے ہوئے بھی میرے ساتھ مشورہ کرنے کے ارادہ سے مسٹر پولک ہمیں سٹینڈرٹن اور گرلنگ سٹیڈ کے درمیان ٹیک ورتھ میں ۹/ تاریخ کو ملے۔ دوپہر کے تین بجے کا وقت تھا۔ ابھی ہماری بات چیت ہو ہی رہی تھی اور مسٹر پولک اور میں دونوں جتھہ کے آگے آگے چلتے جا رہے تھے اور چند اور ساتھی بھی ہماری باتیں سن رہے تھے کیونکہ شام کو مسٹر پولک نے ڈربن جانے والی گاڑی پر سوار ہونا تھا مگر

میرے من کچھ اور ہے کرتا کے کچھ اور

دوران گفتگو میں ہی ایک گھوڑا گاڑی ہمارے سامنے آ پہنچی۔ اس میں ٹرانسوال

کے امیگریشن آفس کے بڑے آفسر مسٹر چمنی اور ایک پولیس افسر بھی تھے۔ دونوں نیچے اتر آئے اور انہوں نے مجھے دور لے جا کر کہا "میں آپ کو گرفتار کرتا ہوں۔"

اس طرح چار دنوں میں تین بار گرفتار ہوا۔ میں نے پوچھا "اس جتھہ کو بھی؟"

انہوں نے جواب دیا "ہم اس کو دیکھ لیں گے۔"

اس سے آگے میں نے کچھ نہیں کہا اور مسٹر پولک سے کہہ دیا کہ وہ جتھہ کے ساتھ جائیں۔ مجھے صرف اپنی گرفتاری کی خبر دینے کی ہی فرصت دی گئی۔ میں نے لوگوں کو پرامن رہنے کے لیے کہنا ہی شروع کیا تھا کہ افسر نے مجھے بیچ میں ہی روک کر کہا "اب آپ قیدی ہیں۔ تقریر نہیں کر سکتے۔"

میں نے اپنی حالت کو بھانپ لیا اور تقریر بند کر کے گاڑی میں جا بیٹھا۔ افسر نے گاڑی بان کو گاڑی تیز چلانے کا حکم دیا اور چشم زدن میں ہم جتھہ سے دور پہنچ گئے۔

مجھے وہ پہلے گریلنگ سٹیڈ میں لے گئے پھر وہاں سے ویل فور ہوتے ہوئے ہیڈلبرگ میں میں نے رات گزاری۔

دوسری طرف ہمارا جتھہ بھی مسٹر پولک کی رہنمائی میں عزم سفر تھا اور رات بھر گریلنگ سٹیڈ میں ٹھہرا۔ دس تاریخ کو صبح نو بجے جتھہ بھی ویل فور پہنچ گیا۔ جہاں تیل سپیشل ریل گاڑیاں انہیں نیٹال لے جا کر پہنچانے کے لیے تیار تھیں۔ لوگ قدرے ضد پکڑ گئے اور بولے "گاندھی کو بلاؤ اگر وہ حکم دیں گے تو ہم گرفتار ہوں گے اور ریل میں بیٹھیں گے۔"

مسٹر پولک اور کاچھلیا سیٹھ نے سمجھایا بجھایا اور یہ کہہ کر کہ آخر کار ہمارے سفر کا مقصد بھی تو جیل جانا ہی ہے۔ مسافروں کو راضی کر لیا اور سب کے سب امن سے ریل میں بیٹھ گئے۔

☆☆☆

باب نمبر ۴۱

ستیہ آگرہ کی فتح

اسی وقت مجھے کمرہ عدالت میں کھڑا کیا گیا۔ اس دفعہ میری گرفتاری ڈنڈی سے جاری شدہ ایک وارنٹ کی بنا پر ہوئی تھی۔ اس لیے وہ مجھے اسی دن ڈنڈی لے گئے۔

دوسری طرف مسٹر پولک کو ویل فور میں گرفتار تو نہ کیا بر عکس اس کے ان کی مدد کے لیے اہلکاروں نے ان کا شکریہ ادا کیا لیکن جس وقت وہ ریل میں سوار ہونے والے تھے۔ انہیں چارلس ٹاؤن میں گرفتار کر لیا گیا۔ مسٹر کیلن بیک بھی بچ نہ سکے۔ دونوں دوستوں کو بوکس رسٹ جیل میں بند کر دیا گیا۔

۱۱/ تاریخ کو ڈنڈی میں مجھ پر مقدمہ چلایا گیا اور مجھے نو ماہ کی سخت قید دی گئی۔

ابھی تو ٹرانسوال میں داخلہ کے لیے لوگوں کو اکسانے کے جرم میں بوکس رسٹ میں مقدمہ چلایا جانا باقی تھا۔ چنانچہ مجھے ۱۳/ تاریخ کو بوکس رسٹ لے گئے۔ وہاں جیل میں مجھے کیلن بیک اور پولک بھی ملے جن کو دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔

۱۴/ تاریخ کو ہم تینوں بوکس رسٹ کی عدالت میں پیش ہوئے۔ سب کو تین تین ماہ کی قید کی سزا ملی۔ بوکس رسٹ جیل میں روزانہ نئے نئے قیدی آتے رہتے تھے اور ہمیں بیرونی حالات کا پتہ چلتا رہتا تھا۔ اس لیے چند دن تو بخوشی گزر گئے۔ ان ستیہ آگرہی قیدیوں میں ہربت سنگھ نام کا ایک ضعیف العمر بھی تھا۔ عمر ۷۵ برس سے زائد ہو گی۔ وہ کانوں میں نوکر نہیں تھا۔ اس نے برسوں پہلے اپنا گرمٹ پورا کر لیا تھا۔ اس لیے وہ ہڑتالی بھی نہیں تھا۔ میری گرفتاری پر عوام میں جوش بڑھ گیا اور کئی لوگ نیٹال سے ٹرانسوال میں

داخل ہوکر گرفتار ہونے لگے تو ہربت سنگھ بھی ان لوگوں میں سے ہی تھا۔

ایک دن میں نے جیل میں ہربت سنگھ سے پوچھا "آپ جیل میں کیوں آئے ہیں؟ آپ جیسے بوڑھوں کو تو میں نے جیل جانے کے لیے نہیں کہا؟"

ہربت سنگھ نے جواب دیا "جب آپ، آپ کی استری اور آپ کے بچے تک ہماری خاطر جیل میں گئے ہیں۔ تو میں کیسے رہ سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "مگر آپ تو جیل کے مصائب کو برداشت نہیں کر سکیں گے۔ آپ جیل چھوڑ کر چلے جائیں تو بہتر ہوگا۔ کیا میں آپ کی رہائش کی کوشش کروں؟"

وہ بولا "میں جیل سے ہرگز باہر نہیں جاؤں گا۔ مجھے تو کسی نہ کسی دن مرنا ہی ہے۔ ایسی قسمت کہاں جو جیل میں مر جاؤں۔"

میں اس کے ارادہ کو کیسے متزلزل کر سکتا تھا۔ اس نیک آدمی کے سامنے میرا سر جھک گیا۔ ہربت سنگھ کی مراد بر آئی۔ وہ جیل میں ہی ۵/ جنوری ۱۹۱۵ء کو مر گیا۔ سینکڑوں ہندوستانیوں کے سامنے ہندو رواج کے مطابق اس کی لاش کو آگ لگائی گئی۔ اس ستیہ آگرہ میں ہربت سنگھ کی مانند ایک نہیں کئی آدمی تھے۔ مگر جیل میں مرنے کی خوش قسمتی حاصل کرنے والے ہربت سنگھ اکیلے ہی تھے۔ اس لیے جنوبی افریقہ کی ستیہ آگرہ کی تاریخ میں ہربت سنگھ کا نام عزت سے لیا جائے گا۔

اچھا اب کوچ کرنے والے لوگوں کی طرف چلیں۔ سپیشل گاڑیاں انہیں نیٹال لے گئیں اور انہیں جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ حکومت نے کانوں کے ارد گرد گھیرے بنا ڈالے اور انہیں ڈنڈی اور نیو کسیل کی جیلوں کا حصہ قرار دے دیا گیا اور مزدوروں کو ان میں ہی کام کرنے کی مشقت دی گئی۔ چنانچہ اس غلامی کے خلاف ہندوستان میں خوب احتجاج ہوا۔

بیماری کے باوجود بالخصوص گوکھلے نے ہمارے لیے کافی کوشش کی تھی۔ اسی عرصہ یعنی دسمبر ۱۹۱۶ء میں لارڈ ہارڈنگ وائسرائے نے اپنی وہ مشہور تقریر کی جس کی وجہ سے جنوبی افریقہ اور انگلینڈ میں جہاں بھی دیکھئے شور مچ گیا تھا۔ اصول تو یہ تھا کہ وائسرائے دیگر مقامات کے متعلق حاشیہ آرائی نہیں کیا کرتے تھے لیکن لارڈ ہارڈنگ نے تو سخت تقریر کر ڈالی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ انہوں نے ستیہ آگرہیوں کی پوری پوری حفاظت کی بھی۔ یہاں تک

کہ ہماری خواہشات اور انداز کار کی تائید کر دی۔ ان کی اس جرأت کا بڑا اچھا اثر پڑا۔ ایک کمشن بیٹھ گیا۔ اگرچہ کوئی بھی ہندوستانی اس کمشن کا ممبر نہیں تھا۔ مگر جنرل سمٹس سے خط و کتابت کرنے پر مجھے یقین ہو گیا کہ ہمارا مقصد کمشن کی رپورٹ کے شائع ہوتے ہی گورنمنٹ نے یونین کے سرکاری گزٹ میں انڈین ریلیف بل شائع کیا جس کے نتیجہ کے طور پر دیر سے ہی سہی لیکن کچھ سمجھوتا ہو گیا۔ اس بل کے ذریعہ:

۱۔ تین پونڈ کا ٹیکس واپس لے لیا گیا۔

۲۔ تمام شادیاں جو ہندوستان میں جائز سمجھی جاتی تھیں افریقہ میں بھی جائز سمجھی جانے لگیں۔

۳۔ انگوٹھے لگانے والا پروانہ حدود میں داخل ہونے کے لیے اجازت نامہ قرار دیا گیا۔

اس طرح آٹھ سال کے بعد ہماری تحریک ختم ہوئی اور یہ معلوم ہونے لگا کہ جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کو اب کچھ آرام ملے گا۔ میں ۱۸/ جولائی ۱۹۱۶ء کو ہندوستان جاتے ہوئے راستہ میں انگلینڈ میں گوکھلے سے ملاقات کے لیے روانہ ہوا۔ میرے جذبات میں جوش اور دکھ کارفرما تھا۔ جوش تو برسوں کے بعد وطن واپس جانے کا تھا اور گوکھلے کے نقش قدم پر وطن کی خدمت کا تھا۔ اور دکھ اس بات کا تھا کہ جہاں میں نے زندگی کے اکیس سالوں میں تلخ اور شیریں تجربات حاصل کیے ہیں اور زندگی کے مقاصد کی بنیاد رکھی ہے۔ اس جنوبی افریقہ سے بڑے دکھ اور افسوس سے وداع ہو رہا تھا۔

☆☆☆

باب نمبر ۴۲

گوکھلے سے ملاقات

پہلے بیان کر چکا ہوں کہ ستیہ آگرہ کی جنگ کے ختم ہونے کے بعد گوکھلے کی ایما سے انگلینڈ ہوتے ہوئے ہندوستان کے لیے روانہ ہوا۔ میرے ساتھ کستوربائی اور کیلن بیک تھے۔ ستیہ آگرہ کے دنوں میں میں نے تیسرے درجہ میں ریل کا سفر کرنا اختیار کیا ہوا تھا۔ اس لیے جہاز میں بھی تیسرے درجہ کا ٹکٹ خریدا۔ مگر ہمارے تیسرے درجہ میں بڑا فرق ہے۔ یہاں تو سونے اور بیٹھنے کی جگہ بھی بڑی مشکل سے ملتی ہے اور صفائی کی تو بات ہی کیا پوچھتے ہیں لیکن برعکس اس کے یہاں کے جہازوں میں کافی جگہ رہتی تھی اور صفائی کا بھی اچھا خیال رکھا جاتا تھا۔ کمپنی نے ہمارے لیے چند دیگر سہولتیں بھی مہیا کر دی تھیں تاکہ ہمیں کوئی تنگ نہ کر پائے۔ اس خیال کو مدنظر رکھ کر ایک پائخانہ میں تالا لگا کر چابی ہمارے سپرد کر دی تھی۔ چونکہ ہم ویجیٹیرین تھے۔ اس لیے ہمیں تازہ اور خشک پھل مہیا کرنے کا حکم جہاز کے خزانچی کو دے دیا گیا تھا۔ معمولی طور پر تیسرے درجہ کے مسافروں کو پھل کم ہی ملتے ہیں اور میوہ تو بالکل نہیں ملتا۔ تاہم اس سہولیت سے ہم نے ۱۸ دن جہاز میں بڑے آرام سے گزارے۔

اس سفر کے کئی واقعات یاد کرنے کے قابل ہیں۔ مسٹر کیلن بیک کو دوربین کا بڑا شوق تھا۔ انہوں نے ایک دو قیمتی دوربینیں اپنے پاس رکھی ہوئی تھیں چنانچہ اس موضوع پر ہماری روزانہ بحث ہوا کرتی تھی۔ میں انہیں یہ سمجھانے کی کوشش کیا کرتا تھا کہ یہ کام ہمارے مطمع نظر اور جس سادگی تک ہم پہنچنا چاہتے ہیں۔ کافی بعید ہے کہ ایک دن تو ہم دونوں میں

اس موضوع پر سرگرم بحث ہوئی اس وقت ہم دونوں اپنی کیبن کی کھڑکی کے قریب کھڑے تھے۔

میں نے کہا "آپ کے اور ہمارے درمیان ایسی تکرار ہونے سے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ اس دوربین کو سمندر میں پھینک دیں؟"

مسٹر کیلن بیک فی الفور بولے "بضرور! اس جھگڑے کی جڑ کو پھینک ہی دیجئے۔"

میں نے کہا "دیکھو ابھی پھینک دیتا ہوں۔"

انہوں نے بلا روک ٹوک کہا "میں سچ کہتا ہوں۔ پھینک دیجئے۔"

بس میں نے دوربین پھینک دی۔ وہ سات پونڈ قیمت کی ہوگی لیکن اس کی قیمت کے برعکس مسٹر کیلن بیک کو اس کے ساتھ جو محبت ہوگئی تھی مگر اس کے باوجود وہ اس بات کو خیال تک میں نہ لایا۔ ان کے اور میرے درمیان ایسے کئی واقعات پیش آئے۔ یہ تو صرف اس کا ایک نمونہ قارئین کے لیے پیش کیا ہے۔

ہم دونوں سچائی کو پیش نظر رکھ کر چلنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ اس لیے میرے اور ان کے تعلقات کے نتیجہ کے طور پر ہم روزانہ کوئی نہ کوئی نئی بات سیکھتے تھے۔ سچائی کی تقلید میں ہمارا غصہ خودغرضی اور عناد وغیرہ آسانی سے ہی دور ہو جاتا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حقانیت سے دور ہی رہتے۔ محبت اور الفت کا گرویدہ آدمی سادہ مزاج ہوا کرتا ہے اور زبانی طور پر سچائی پر بے شک عمل کرتا جائے لیکن اس سے کامل سچائی کا حصول ممکن نہیں ہے اور سچائی کو جھنجھوڑ کر معلوم کرنے سے محبت اور نفرت کی تکرار کے بعد آزادی حاصل ہوتی ہے۔

جن ایام میں ہم نے یہ سفر اختیار کیا تھا۔ اس سے قبل ٹالسٹائی آشرم کے باسیوں کی ذاتی کمزوری کی وجہ سے میں نے سات اور چودہ دن کا برت رکھا تھا۔ میں یہ پہلے بیان کر چکا ہوں۔ ان برتوں کی وجہ سے جسم میں ابھی تک کمزوری پائی جاتی تھی۔ اس لیے جہاز میں ڈیک پر اچھی طرح گھوم کر سیر کرنے لگا اور خوراک کو ہضم کرنے کی کوشش میں رہتا مگر زیادہ گھومنے سے پنڈلیوں میں درد ہونے لگ گیا۔ اور ولایت پہنچنے کے بعد تو یہ درد کافی بڑھ گیا۔ وہاں ڈاکٹر جیوراج مہتہ سے ملاقات ہوگئی تھی۔ برت اور درد کی کیفیت سن کر انہوں نے کہا۔ اگر آپ کچھ عرصہ کے لیے آرام نہیں کریں گے تو آپ کے پاؤں کا ہمیشہ کے لیے سن ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس کے بعد مجھے یہ معلوم ہوا کہ برت کے بعد طاقت کے واپس

لانے کے لیے زیادہ کھانے کا لالچ نہیں کرنا چاہیے۔ برت رکھنے کے بعد کھانا جاری کرتے وقت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے اور شاید اس میں زیادہ ضبط بھی ہوا کرتا ہے۔

مدرا میں ہمیں خبر ملی کہ اب جنگ چھڑنے کو ہے۔ انگلینڈ کے ساحل کے قریب پہنچتے پہنچتے پتہ چلا کہ جنگ شروع ہوگئی ہے۔ اس لیے ہم روک لئے گئے۔ پانی میں کئی مقامات پر خفیہ راستے بنائے گئے تھے۔ ان میں سے گزر کر ہمیں ساؤتھ تھمپٹن پہنچنے پر ایک دو دن دیر لگ گئی۔ اعلان جنگ ۴/اگست کو ہوا اور ہم ۱۶/اگست کو ولایت پہنچے۔

☆☆☆

باب نمبر ۴۴

جنگ میں حصہ

ولایت پہنچتے ہی خبر ملی کہ گوکھلے تو پیرس میں ہی رہ گئے ہیں۔ پیرس سے آمد و رفت کا سلسلہ منقطع ہوگیا ہے اور یہ کہا نہیں جا سکتا کہ وہ کب آئیں گے۔ گوکھلے صحت کو درست کرنے کے لیے فرانس گئے تھے مگر اسی اثناء میں جنگ جاری ہونے کی وجہ سے وہاں رک گئے۔ ان سے ملے بغیر میں وطن نہیں جا سکتا تھا لیکن یہ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کب آئیں گے۔

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ درمیانی عرصہ میں کیا کیا جائے۔ لڑائی کے متعلق میرا کیا فرض ہے؟ میرے جیل کے ساتھی ستیہ آگرہی سراب جی اڈجزیا ولایت میں بیرسٹری کا مطالعہ کر رہے تھے۔ سہراب جی کو ایک اعلیٰ ستیہ آگرہی کے طور پر انگلینڈ میں بیرسٹری کے لیے بھیجا گیا تھا تا کہ واپس جنوبی افریقہ ہماری جگہ کام کرنے لگ جائے۔ ان کے اخراجات کے متکفل ڈاکٹر پران جیون مہتہ تھے۔ ان کے ذریعہ جیوراج مہتہ وغیرہ سے جو ولایت میں پڑھ رہے تھے۔ اس موضوع پر مشورہ کیا۔ اس زمانہ میں جتنے ولایت میں ہندوستانی رہتے تھے۔ ان کا اجلاس بلایا گیا اور میں نے ان کے سامنے اپنے خیالات پیش کئے اور میرا یہ خیال تھا کہ انگلینڈ میں رہنے والے ہندوستانی جنگ میں اپنا حصہ ادا کریں۔ انگریز طالب علم جنگ میں خدمت کرنے کا ارادہ ظاہر کر چکے تھے۔ ہم ہندوستانیوں کو ان سے کم مدد نہیں دینی چاہیے۔ چنانچہ میرے ان خیالات کے خلاف اسی اجلاس میں کافی دلائل پیش کئے گئے کہا گیا کہ ہماری اور انگریزوں کی حالت میں ہاتھی اور گھوڑے کا فرق ہے۔ ایک غلام اور دوسرا

سردار ہے۔اس حالت میں غلام اپنے آقا کی مصیبت میں اپنی مرضی سے کس طرح مدد کرسکتا ہے۔ علاوہ بریں جو غلام آزادی کا طلب گار ہو کیا اس کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ آقا کی مصیبت سے فائدہ حاصل کر کے اپنی آزادی کے لیے کوشش کرے؟ مگر اس دلیل سے میری اس وقت کس طرح تسلی ہو سکتی تھی۔ اگرچہ میں دونوں تضاد کو سمجھ گیا تھا۔ مگر اس کے باوجود مجھے اپنی حالت غلاموں سے متضاد نظر آئی۔ اس وقت میرا یہ خیال تھا کہ انگریزی طرزِ حکومت کے برعکس کئی انگریز حاکموں کا زیادہ نقص ہے۔ اس نقص کو ہم محبت سے دور کر سکتے ہیں۔ میرا یہ خیال تھا کہ انگریزوں کے ذریعہ اور ان کی مدد سے ہم اپنی اصلاح کر سکیں تو ہمیں ان کی تکلیف کے وقت مدد دے کر اپنی اصلاح کرنی چاہیے۔ برٹش طرزِ حکومت کو اگرچہ میں بہتر خیال نہیں کرتا۔ مگر آج کل کی مانند اس وقت وہ ناقابل برداشت معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے آج جس قسم کے آئین حکومت سے میرا اعتماد اٹھ گیا ہے اور آج میں انگریزی حکومت کی مدد نہیں کرسکتا۔ اس طرح اس وقت جن لوگوں کا یقین اس طرزِ طریق پر نہیں تھا۔ بلکہ انگریزی حاکموں سے بھی متنفر تھے۔ وہ مدد کے لیے کس طرح تیار ہو سکتے تھے؟

انہوں نے اس وقت پبلک کے مطالبات کو پرزور ڈھنگ سے پیش کرنے اور آئین میں تبدیلی کے لیے مناسب موقعہ سمجھا۔ مگر میں نے اس وقت انگریزوں کی تکلیف کی حالت میں مطالبات پیش کرنا مناسب خیال نہ کیا یعنی جب تک جنگ کا زمانہ ہے ہمیں اپنے مطالبات ملتوی کرنے چاہئیں۔ چنانچہ میں ارادے پر اٹل رہا اور کہا کہ جنہیں والنٹیر وں میں نام درج کرانا ہو۔ نام درج کرا دیں۔ بے شمار لوگوں نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ ان میں لگ بھگ تمام صوبوں اور مذہبوں کے لوگ تھے۔

اس کے بعد لارڈ کرو کے نام ایک خط لکھا گیا جس میں ہم نے اپنے خیالات اور تیاری کا ذکر کیا کہ ہم ہندوستانیوں کو زخمی سپاہیوں کی خدمت کی احتیاج ہے۔ اگر یہ انتظام کر دیا جائے تو ہم تیار ہیں۔ قدرے غور و فکر کے بعد لارڈ کرد نے ہماری تجویز منظور کر لی اور ہمارا ممنون ہو گیا کہ ہم نے ایسے موقعہ پر حکومت کی مدد کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔

جن جن لوگوں نے اپنے نام تحریر کرائے تھے۔ انہوں نے مشہور ڈاکٹر کنٹیلی کی نگرانی میں زخمیوں کی تیمارداری کی ابتدائی تعلیم شروع کی۔ چھ ہفتہ کا کورس تھا۔ اتنے عرصہ

میں زخمیوں کی خدمت کے ہر پہلو سے واقفیت ہو گئی۔ ہم ۸۰ والنٹیر اس کلاس میں شامل تھے۔ چھ ہفتہ بعد امتحان لیا گیا تو اس وقت صرف ایک آدمی فیل ہوا اور جو لوگ پاس ہو گئے انہیں گورنمنٹ کی طرف سے قواعد سکھانے کا انتظام کیا گیا۔ قواعد سکھانے کا کام کرنل بیکر کے سپرد کیا گیا اور انہیں اس جتھہ کا سردار بنایا گیا۔

اس وقت ولایت کا نظارہ قابلِ دید تھا۔ جنگ کی وجہ سے لوگوں میں گھبراہٹ نہیں تھی۔ بلکہ تمام لوگ حسب استطاعت اس میں مدد کے لیے کمربستہ تھے۔ جن کی جسمانی حالت اچھی تھی۔ وہ نوجوان فوجی تعلیم حاصل کرنے لگ گئے۔ مگر کمزور بوڑھے اور عورتیں بھی خالی نہیں رہی تھیں۔ ان کے لیے بھی کام تو تھا ہی وہ فوجیوں کے کپڑے سینے اور زخمیوں کی پٹیاں تیار کرنے میں لگ گئے۔

اس وقت سروجنی دیوی بھی وہیں تھیں۔ انہوں نے اس کام میں خوب دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس وقت میری ان سے پہلے پہل ہی ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے کپڑے کاٹ کر میرے سامنے ان کا ڈھیر لگا دیا اور کہا جتنے سلا سکو اتنے سلا کر مجھے دے دینا۔ میں نے ان کی رائے سے زخمیوں کی تیمارداری کی اس تعلیم کے ایام میں جتنے کپڑے تیار ہو سکے اتنے ہی کر کے دے دیے۔

اس طرح اپنا فرض خیال کر کے میں جنگ میں شامل تو ضرور ہوا مگر میری قسمت میں یہ لکھا نہیں تھا کہ اس میں براہ راست مدد کر سکوں بلکہ ایسے نازک موقعہ پر ستیہ آگرہ تک کرنے کی نوبت آ گئی۔

☆☆☆

باب نمبر ۴۴

گوکھلے کی فراخدلی

ولایت میں مجھے پسلی کے درد کی شکایت ہوگئی تھی۔ اس بیماری کی حالت میں گوکھلے ولایت آ پہنچے تھے۔ ان کے پاس کیلن بیک اور میں ہمیشہ جایا کرتے تھے۔ ان میں زیادہ تر جنگ کی ہی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ جرمنی کا جغرافیہ کیلن بیک کو ازبر تھا اور یورپ کا سفر انہوں نے کئی بار کیا تھا۔ اس لیے نقشہ پھیلا کر وہ گوکھلے کو لڑائی کی چھاؤنیاں دکھایا کرتے تھے۔

جب میں بیمار تھا تو میری بیماری کا ذکر بھی گفتگو کا موضوع بن گیا۔ خوراک کے تجربات تو اس وقت بھی جاری تھے۔ اس وقت میں مونگ پھلی، کچے اور پکے کیلے، لیموں اور زیتون کا تیل، ٹماٹر، انگور وغیرہ چیزیں کھاتا تھا۔ دودھ، اناج والی غذا وغیرہ کا استعمال نہیں کرتا تھا مگر نگہداشت جیوراج جی کیا کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے دودھ اور اناج استعمال کرنے پر کافی زور دیا اور یہ شکایت گوکھلے تک پہنچائی۔ پھل وغیرہ کے استعمال کے دلائل کے وہ قائل نہیں تھے۔ تندرستی کے تحفظ کے لیے ڈاکٹر جو کچھ بتائیں وہ استعمال کرنا چاہیے۔ یہی ان کا خیال تھا۔

گوکھلے کی باتوں سے روگردان ہونا میرے لیے بڑا مشکل تھا۔ جب انہوں نے کافی زور دیا تو میں نے ان سے ۲۴ گھنٹے سوچنے کی مہلت مانگی۔ کیلن بیک اور میں گھر آئے۔ راستہ میں ان کے ساتھ ذکر چھیڑا کہ اس وقت میرا کیا فرض ہے؟ میرے تجربات میں وہ بھی شامل تھے۔ انہیں یہ تجربات پسند بھی تھے۔ مگر ان کا رخ اس طرف تھا کہ اگر صحت کے لیے میں اس تجربہ کو چھوڑ دوں تو بہتر ہوگا۔ اس لیے اب اپنے دل کی آواز کا فیصلہ لینا ہی

باقی رہ گیا تھا۔

میں ساری رات سوچتا رہا۔ اس وقت اگر میں اپنے تجربات سے دست بردار ہو جاتا تو میرے تمام خیالات مٹی میں مل جاتے تھے۔ مگر اس کے باوجود مجھے ان خیالات میں غلطی کا احتمال نظر نہیں آتا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ کس حد تک گوکھلے کی محبت کے زیر اثر میرا فرض کامیاب ہوتا ہے یا مجھے اپنے جسم کی حفاظت کے لیے اپنے تجربہ سے بے رخی اختیار کرنی چاہیے۔ آخرکار میں نے یہ فیصلہ کیا کہ مذہبی نقطۂ نگاہ سے تجربہ کا جتنا حصہ ضروری ہے۔ اسی قدر رہنے دیا جائے اور باقی امور میں ڈاکٹروں کی رائے تسلیم کی جائے۔ میرے دودھ چھوڑنے میں دھارمک احساسات غالب تھے۔ کلکتہ میں گائے اور بھینس کا دودھ جن خوفناک طریقوں سے دوہا جاتا تھا۔ وہ نظارہ میری آنکھوں کے سامنے تھا اور یہ خیال بھی موجود تھا کہ گوشت کی طرح حیوانات کا قتل انسانی خوراک کے لیے نہیں ہے۔ اس لیے دودھ کو چھوڑنے کے پختہ ارادہ سے میں صبح اٹھا۔ اس فیصلہ سے میرا دل کافی ہلکا ہوگیا تھا مگر اس کے باوجود گوکھلے کا خوف تو تھا ہی مگر ساتھ ہی مجھے یہ یقین تھا کہ وہ میرے فیصلہ کو رد کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔

شام کو نیشنل لبرل کلب میں ہم انہیں ملنے گئے۔ تو انہوں نے فی الفور پوچھا ''کیوں کیا ڈاکٹر کے مشورہ پر ہی عمل کا ارادہ کیا ہے نا؟''

میں نے آہستگی سے جواب دیا ''اور سب باتوں کو تو میں مان لوں گا مگر آپ ایک بات پر زور نہ دیجیے۔ دودھ اور دودھ کی بنی ہوئی چیزیں میں نہیں لوں گا اور ان کے نہ لینے پر اگر موت بھی آتی ہو تو میں خیال کرتا ہوں اس کا استقبال کرنا میرا فرض مقدم ہے۔''

وہ بولے ''کیا تم نے یہ پختہ ارادہ کر لیا ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ اس کے علاوہ میں آپ کو اور کوئی جواب نہیں دے سکتا اور میں جانتا ہوں کہ اس طرح آپ کو ضرور تکلیف ہوگی لیکن مجھے معاف فرمائیے۔''

گوکھلے نے قدرے دکھ سے مگر نہایت محبت افروز ڈھنگ سے کہا ''تمہارا یہ خیال مجھے پسند نہیں ہے۔ مجھے اس معاملہ میں دھرم کی کوئی بات نظر نہیں آئی لیکن اب میں اس بات پر زور نہیں دوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے جیوراج مہتہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے ''اب

گاندھی کو زیادہ دق نہ کرو۔ انہوں نے جو قاعدہ بنا رکھا ہے اس کے مطابق جن چیزوں کا استعمال کر سکتے ہوں وہی دینی چاہئیں۔''

ڈاکٹر از حد خوش ہوا مگر وہ لاچار تھا۔ مجھے مونگ کی دال کے استعمال کا مشورہ دیا اور کہا۔ اس میں ہینگ کا بگھار دے لینا۔ میں نے یہ مان لیا۔ ایک دو دن تک میں نے وہ پانی استعمال کیا۔ مگر الٹا اس سے میرا درد بڑھ گیا۔ مجھے موافق نہ آیا۔ اس لیے پھر میں نے پھل کھانے شروع کر دیئے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر نے دوسرے علاج کے لیے جو کچھ مناسب خیال کیا تھا' دیا۔ البتہ اس سے آرام ضرور ہوا مگر میری ان عادتوں سے وہ سخت بگڑے۔ اتنے میں گوکھلے ہندوستان چلے گئے۔ کیونکہ وہ لندن میں اکتوبر اور نومبر کا کہر برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

پسلی کا درد' خوراک کی تبدیلی اور دیگر تجربات سے دور ہو گیا۔ مگر بیماری بالکل دور نہ ہو سکی۔ ابھی احتیاج کی ضرورت تھی۔ ابھی بستر پر ہی دراز رہنا تھا۔ ڈاکٹر مہتہ کبھی کبھی آ کر معائنہ کر جاتے تھے اور جاتی بار کہہ جایا کرتے تھے کہ اگر میرا علاج کرو گے تو دیکھتے ہی دیکھتے آرام آ جائے گا۔

ایسا عمل جاری تھا کہ ایک دن مسٹر رابرٹس میرے مکان پر آئے اور مجھے زور دے کر کہا کہ ''آپ ہندوستان چلے جاؤ۔'' انہوں نے کہا کہ اس حالت میں آپ نٹیلی ہسپتال میں نہیں جا سکتے۔ کڑاکے کی سردیاں تو ابھی آنے والی ہیں اور میں تاکید کرتا ہوں کہ آپ ہندوستان چلے جائیں تو وہاں جا کر اچھے ہو جائیں گے۔ اگر اس وقت تک جنگ جاری رہی تو اس میں مدد کے اور بھی مواقعہ میسر آ سکتے ہیں ورنہ جو کچھ آپ نے یہاں کیا ہے میں اسے بھی کم خیال نہیں کرتا۔

☆☆☆

باب نمبر ۴۵

الوداعی

مسٹر کیلن بیک وطن جانے کے ارادہ سے ہمارے ساتھ روانہ ہوئے تھے۔ ولایت میں ہم اکٹھے ہی رہتے تھے۔ جنگ کی وجہ سے جرمنوں پر سخت نگرانی کی جاتی تھی اور ہمیں اس بات پر شک تھا کہ کیلن بیک ہمارے ساتھ آ سکیں گے یا نہیں۔ ان کے لیے پاسپورٹ حاصل کرنے کی کوشش کی گئی اور مسٹر رابرٹس انہیں پاسپورٹ دلانے پر بذات خود آمادہ تھے۔ اس کے لیے انہوں نے تار کے ذریعہ تمام حالات سے مطلع کیا۔ مگر لارڈ ہارڈنگ کا نہایت خشک جواب ملا۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم کسی طرح یہ ذمہ داری لینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس جواب کو سب نے مناسب خیال کیا۔ کیلن بیک کی جدائی کا اگرچہ مجھے ضرور دکھ ہوا۔ مگر میں نے دیکھا کہ میری بجائے انہیں زیادہ دکھ ہوا ہے۔ اگر وہ ہندوستان آ سکتے تو آج ایک اچھے کسان اور جلاہے کی سادا زندگی بسر کرتے۔ اب وہ جنوبی افریقہ میں اسی طرح اپنی سادہ زندگی بسر کرتے ہیں اور عمارتوں کی تیاری کا کام کرتے ہیں۔

ہم نے تیسرے درجہ کا ٹکٹ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن پی اینڈ او کے جہاز میں دوسرے درجہ کا ٹکٹ ملا۔ جنوبی افریقہ سے ہم کافی پھل وغیرہ لائے تھے۔ جو جہازوں میں دستیاب نہیں ہوتا تھا۔

ڈاکٹر مہتہ نے میرے جسم کو میٹس پلاسٹر کی پٹی سے باندھ دیا تھا اور مجھے کہا تھا کہ پٹی بندھی رہنی چاہیے۔ مگر دو دن بعد میں اسے برداشت نہ کر پایا اور بڑی مشکل کے بعد میں نے اسے اتار ڈالا اور نہانے دھونے بھی لگ گیا۔ پھلوں اور میوں کے علاوہ اور کسی چیز کو کام

میں نہیں لاتا تھا۔ طبیعت دن بدن سدھرنے لگی۔ نہر سویز تک پہنچنے تک میری صحت برقرار ہوگئی۔ اگرچہ جسم کمزور ہوگیا تھا اور بیماری کا خوف چلا گیا تھا۔ میں روزانہ آہستہ آہستہ ورزش کرتا تھا اور میرا خیال تھا کہ میری صحت آب وہوا کی تبدیلی سے آہستہ آہستہ سدھر جائے گی۔

پرانے تجربہ یا اور کسی وجہ سے انگریز مسافروں کے اور میرے درمیان جو فرق میں نے دیکھا تھا وہ جنوبی افریقہ سے آتے ہوئے بھی معلوم نہ ہوا کہ کونسا فرق تھا لیکن یہاں اس میں اور ہی قسم کی تبدیلی نظر آئی۔ کئی انگریزوں کے ساتھ گفتگو ہوئی مگر وہ صرف صاحب سلامت سے بڑھ کر نہیں تھی۔ البتہ جنوبی افریقہ کے جہاز میں اور جنوبی افریقہ کے دل ملاپ میں ہوسکتا تھا تاہم اس فرق کی وجہ تو یہی تھی کہ اس طرف کے عام انگریزوں کے دلوں میں یہ خیال کہ ہم حاکم ہیں اور ہندوستانیوں کے جی میں یہ خیال کارفرما تھا کہ ہم غلام ہیں۔

ایسے کرہ ہوائی سے جلد آزاد ہوکر میں ہندوستان پہنچنے کے لیے خواہش مند ہورہا تھا۔ عدن پہنچنے پر یہ محسوس ہوا کہ جس طرح گھر کے قریب آ گیا ہوں۔ عدن والوں کے ساتھ جنوبی افریقہ میں ہی ہمارا اچھا تعلق ہوگیا تھا کیونکہ بھائی کیقباد کاوس جی دین شاہ ڈربن آ گئے تھے۔ ان کے اور ان کی استری کے ساتھ میری اچھی جانکاری ہوگئی تھی پھر تھوڑے عرصہ کے بعد ہم بمبئی آ پہنچے۔ جس ملک میں ۱۹۰۳ء میں واپس آنے کی امید رکھتا تھا۔ وہاں دس سال بعد پہنچنے پر میرے دل کو بڑی مسرت حاصل ہوئی۔ بمبئی میں گوکھلے وغیرہ نے استقبال کا انتظام وغیرہ کر رکھا تھا۔ ان کی طبیعت نازک تھی۔ مگر اس کے باوجود بمبئی آ پہنچے تھے۔

گوکھلے سے مل کر اور ان کے بار کو ہلکا کر دینے کے خیال سے میں بمبئی آیا تھا لیکن قدرت نے کچھ اور ہی بنا رکھا تھا۔

☆☆☆

باب نمبر ۴۶

پونا میں گوکھلے کے ساتھ

میرے بمبئی پہنچتے ہی گوکھلے نے مجھے خبر دی کہ بمبئی کے گورنر آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ پونا پہنچنے سے پہلے آپ ان سے ملتے آئیں تو بہتر رہے گا۔ اس لیے میں ان سے ملنے گیا۔ معمولی بات چیت کے بعد انہوں نے مجھے کہا۔

"میں آپ سے ایک اقرار لیتا ہوں اور سچے دل سے چاہتا ہوں کہ حکومت کے متعلق اگر آپ کو کوئی تحریک چلانی ہو تو اس سے قبل مجھے مل لیں اور بات چیت کر لیں۔"

میں نے جواب دیا "یہ زبان دینی میرے لیے مشکل نہیں ہے کیونکہ ستیہ آگرہی کے ناطے میرا یہ اصول ہے کہ کسی کے خلاف کوئی آواز بلند کرنے سے قبل اس کے متعلق خود اس سے واقفیت حاصل کر لوں اور جہاں تک اپنے سے بن پڑے ان کے مقرب ہونے کی کوشش کروں۔ میں نے ہمیشہ جنوبی افریقہ میں اس اصول پر عمل کیا ہے اور یہاں بھی میں ایسا ہی کرنے کا خیال کرتا ہوں۔

لارڈ ولنگڈن نے یہ سن کر میرا شکریہ ادا کیا اور کہا "آپ جب چاہیں میرے ساتھ ملاقات کر سکتے ہیں اور آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ حکومت جان بوجھ کر کوئی برائی نہیں کرنا چاہتی۔"

میں نے جواب دیا "میں اسی یقین پر ہی جی رہا ہوں۔"

اب میں پونا پہنچا۔ وہاں کے تمام حالات بیان کرنا میری قوت یادداشت سے بعید ہے۔ گوکھلے اور سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے ممبروں نے مجھے اپنی محبت میں رنگ دیا۔ مجھے جہاں تک یاد ہے انہوں نے تمام ممبران کو پونا میں مدعو کیا اور سب کے ساتھ میری دل

کھول کر باتیں کرائیں۔ گوکھلے کی زبردست خواہش تھی کہ میں بھی ان کی سوسائٹی کا ممبر بن جاؤں اور میں بھی چاہتا تھا مگر ممبران کا یہ خیال ہوا کہ سوسائٹی کے اصول اور مقاصد اور طریق کار میرے خلاف ہیں۔ اس لیے وہ عجیب مخمصہ میں تھے کہ مجھے ممبر بنانا چاہیے یا نہیں۔ گوکھلے کا یہ خیال تھا کہ میرا اپنے آدرش پر مصمم رہنے کا جو خیال ہے اسی قدر دوسروں کے آدرش کی حفاظت اور ان کے ساتھ مل جانے کی عادت بھی تھی۔ انہوں نے کہا۔ شائد ہمارے رفیق ابھی آپ کے دوسروں کو گرویدہ کر لینے کی صفت سے عاری ہیں۔ آپ اپنے خیالات پر مستحکم رہنے والے آزاد خیال آدمی ہیں۔ امید تو یہی رکھتا تھا کہ وہ مجھے ممبر بنانا منظور کر لیں گے لیکن اگر نہ بھی کر سکیں تو آپ اس سے ہرگز یہ خیال نہیں کر سکیں گے کہ آپ سے آپ کی محبت کم پائی جاتی ہے۔ اپنی محبت کے استوار ہونے کو اس انداز میں دیکھ کر ہی وہ کسی قسم کی تکلیف اٹھانے سے خوف کھاتے تھے لیکن آپ ان کے باقاعدہ ممبر بنیں یا نہ بنیں میں تو آپ کو ممبر تسلیم ہی کروں گا۔

سوسائٹی کا ممبر بنوں یا نہ بنوں ایک آشرم بنا کر فینکس کے ساتھیوں کو اس میں رکھ کر وہاں بیٹھ جانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنا یہ ارادہ انہیں بتا دیا تھا۔ گجراتی ہونے کی وجہ سے گجرات کے ذریعہ خدمت کرنے کا جذبہ میرے دل میں کافی ہونا چاہیے۔ اس خیال سے گجرات میں ہی کسی جگہ قیام کا خیال تھا۔ گوکھلے میرے خیال کو سن کر خوش ہوئے اور بولے۔

"آپ ضرور آشرم قائم کریں اور میرے ممبروں سے جو بات چیت ہوئی ہے۔ اس کا نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو۔ تمہارے آشرم کے لیے میں روپیہ کا انتظام کروں گا اور اسے میں اپنا ہی آشرم خیال کروں گا۔"

یہ سن کر جی خوش ہو اٹھا۔ چندہ مانگنے کی تکلیف سے "خلاصی پائی"۔ یہ سمجھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی اور اس خیال سے کہ اب مجھے؛ کیلے اپنی ذمہ داری سے کچھ کرنا پڑے گا۔ بلکہ ہر ایک الجھن کے وقت میرے لیے یہاں ایک رہنما ہوگا۔ جس سے میرا بار ہلکا ہو جائے گا۔"

گوکھلے نے مرحوم ڈاکٹر دیو کو بلا کر کہہ دیا۔ گاندھی کا کھاتا اپنی سوسائٹی کے رجسٹر میں کھول لو اور انہیں اپنے اور پبلک کے کاموں کے لیے جس قدر روپیہ کی ضرورت ہو دیتے رہو۔

اب کے بعد میں پونا چھوڑ کر شانتی نکتین جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ آخری ایام میں گوکھلے نے اپنے خاص دوستوں کی ایک پارٹی ایسے ڈھنگ سے بلائی جو میرے دلی ارادہ کے مناسب تھی۔ اس میں پھل اور میوے منگوائے جن کا میں استعمال کیا کرتا تھا۔ پارٹی ان کے کمرہ سے تھوڑے فاصلہ پر تھی۔ ان کی ایسی حالت نہیں تھی کہ وہ وہاں تک آ سکتے تھے۔ لیکن انہیں غش آ گیا اور واپس جانا پڑا۔ ایسی غشی انہیں بار بار آ جایا کرتی تھی۔ اس لیے انہوں نے کہلا بھیجا کہ پارٹی میں کسی قسم کی گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے۔ پارٹی کیا تھی۔ سوسائٹی کے آشرم میں مہمان خانہ کے پاس میدان میں جاجم بچھا کر ہم بیٹھ گئے اور مونگ پھلی اور کھجور وغیرہ کھاتے ہوئے محبت سے باتیں کر رہے تھے اور ایک دوسرے کے دل کو قابو میں لینے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرتے تھے لیکن ان کی یہ غشی میری زندگی کے لیے کوئی معمولی تجربہ نہیں تھا۔

☆☆☆

باب نمبر ۴۷

دھمکی

بمبئی سے مجھے اپنی بیوہ بھابی اور دوسرے قبیلہ والوں سے ملنے کے لیے راج کوٹ اور پور بندر جانا تھا۔ اس لیے میں راج کوٹ پہنچا۔ جنوبی افریقہ میں ستیہ آگرہ کی تحریک کے سلسلہ میں میں نے اپنا لباس جس حد تک ممکن تھا۔ گرنٹیا مزدوروں کی مانند بنا لیا تھا۔ میری مانند کپڑے پہننے والا عام طور پر غریب ہی خیال کیا جاتا تھا۔ اس وقت ویرم گاؤں اور بڑوان میں پلیگ کی وجہ سے تیسرے درجہ کے مسافروں کی پڑتال ہوا کرتی تھی۔ مجھے اس وقت معمولی بخار تھا۔ تشخیص کنندہ افسر نے میرا ہاتھ دیکھا تو اسے گرم معلوم ہوا۔ اس لیے اس نے حکم دیا کہ راج کوٹ پہنچ کر ڈاکٹر سے معائنہ کراؤ۔ پھر میرا نام لکھ لیا۔

بمبئی سے شاید کسی نے چٹھی یا تار بھیجا ہوگا۔ اسی لیے بڑوان سٹیشن پر موتی لعل درزی جو وہاں کے ایک مشہور پبلک کارکن خیال کئے جاتے تھے۔ مجھے ملنے آئے۔ انہوں نے مجھے ویرم گاؤں کی زکات کی پڑتال اور اس کے متعلق پیش آنے والی تکلیفات کا ذکر کیا۔ مجھے بخار چڑھ رہا تھا۔ اس لیے بات کرنے کے لیے جی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے انہیں مختصراً جواب دیا۔

''آپ جیل جانے کے لیے تیار ہیں؟''

اس وقت میں نے موتی لعل کو ایسا ہی نوجوان خیال کیا جو بلا غور و فکر جوش میں ہاں کر لیتے ہیں لیکن انہوں نے پورے استقلال سے جواب دیا۔

''ضرور جیل جاؤں گا۔ مگر آپ کو ہمارا لیڈر بننا ہوگا۔ کاٹھیاواڑ کی حیثیت سے

آپ پر ہمارا حق ہے۔ ابھی تو ہم آپ کو روک نہیں سکتے لیکن واپسی کے وقت آپ کو بڑوان ضرور اترنا پڑے گا۔ یہاں کے نوجوانوں کا کام اور جوش دیکھ کر آپ خوش ہو جائیں گے۔ آپ جب چاہیں ہمیں اپنی فوج میں بھرتی کر سکتے ہیں۔''

راج کوٹ پہنچتے ہی دوسرے دن صبح قبل الذکر حکم کے مطابق ہسپتال پہنچا۔ وہاں میں کسی کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ ڈاکٹر مجھے دیکھ کر شرمایا اور اس جانچ کنندہ پر ناراض ہوا مگر مجھے غصہ کی کوئی وجہ نظر نہیں آئی تھی۔ کیونکہ اس نے اپنا فرض ادا کیا تھا۔ ایک تو وہ مجھے پہچانتا نہیں تھا اور پھر وہ تو اپنے فرض کو ادا کر رہا تھا۔ مگر میں تھا مشہور آدمی اس لیے راج کوٹ میں مجھے معائنہ کرانے لئے جانے کے عوض میں لوگ گھر آ کر میری پوچھ تاچھ کرنے لگے۔

کاٹھیا واڑ میں جہاں بھی پہنچا۔ وہاں ویرم گاؤں کی زکات کی پڑتال والی تکلیفات کی شکائتیں سنیں۔

لارڈ ولنگڈن نے مجھے جو دعوت دی ہوئی تھی۔ اس سے میں نے فی الفور فائدہ اٹھایا۔ اس معاملہ کے متعلق مجھے جتنی شکائتیں ملیں میں نے سب کو پڑھا اور دیکھا کہ اس میں کافی سچائی تھی۔ اس لیے میں نے اس سلسلہ میں بمبئی کی حکومت سے خط و کتابت کی۔ سیکرٹری سے ملاقات کی اور لارڈ ولنگڈن سے بھی ملا۔ انہوں نے ہمدردی کا اظہار کیا اور کہا کہ مرکزی حکومت کی وجہ سے دیر لگ رہی ہے۔ اگر یہ معاملہ ہمارے ہاتھ میں ہوتا تو ہم کب کے اس زکات کو دور کر دیتے۔ آپ حکومت ہند کے پاس اپنی شکایت لے جائیں۔ سیکرٹری نے بھی یہی جواب دیا۔

اس کے بعد میں نے حکومت ہند کے ساتھ خط و کتابت شروع کی۔ وہاں سے خط کی رسید کے علاوہ اور کوئی جواب نہ ملا۔ جب مجھے لارڈ چیمسفورڈ سے ملنے کا موقعہ ملا۔ یعنی دو تین سال کی خط و کتابت کے بعد قدرے شنوائی ہوئی تو لارڈ چیمسفورڈ سے میں نے اس کا ذکر بیان کیا تو انہوں نے حیرت کا اظہار کیا کیونکہ ویرم گاؤں کے معاملہ کا انہیں بالکل علم نہیں تھا۔ انہوں نے میری باتیں غور سے سنیں اور اسی وقت ٹیلی فون کر کے کاغذات طلب کئے اور کہا کہ اگر اس سلسلہ میں وہاں کے اہلکاروں کی شکایت نہ ہوئی تو زکات رد کر ڈالی جائے گی۔ اس ملاقات کے چند دن بعد ہی اخبارات میں پڑھ کہ زکات رد کر دی گئی ہے۔

اس فتح کو میں نے ستیہ آگرہ کی بنیاد تسلیم کیا۔ کیونکہ جب ویرم گاؤں کے متعلق باتیں ہوئیں تو اس وقت حکومت بمبئی کے سیکرٹری نے مجھے کہا تھا کہ بکسرا میں اس موضوع پر آپ کی جو تقریر ہوئی تھی۔ اس کی نقل آئی ہے۔ اس میں نے ستیہ آگرہ کا ذکر کیا ہے۔ اس پر انہوں نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور مجھ سے پوچھا ''آپ اسے دھمکی خیال نہیں کرتے؟ اتنی طاقتور حکومت بھلا دھمکی کی پرواہ کرسکتی ہے۔''

میں نے جواب دیا ''یہ دھمکی نہیں ہے بلکہ عوام کی رائے کو تعلیم سے سرفراز کرنے کی کوشش ہے۔ لوگوں کا اپنی تکلیفات کے دور کرنے کے لیے ہر ایک مناسب تدبیر کو کام میں لانا میرے جیسے آدمیوں کا فرض مقدم ہے۔ جو لوگ آزادی کے خواہش مند ہیں۔ ان کے پاس اپنی حفاظت کا آخری علاج ضرور ہونا چاہیے۔ عام طور پر اس قسم کے علاج بربریت لیے ہوتے ہیں لیکن ستیہ آگرہ اس سے بالکل متضاد بات ہے۔ اس کے استعمال اور اس کی بابت بتانا میں اپنا فرض خیال کرتا ہوں۔ انگریزی حکومت بڑی طاقتور ہے۔ میں اس سے انکار نہیں کرسکتا لیکن ستیہ آگرہ سب سے بہتر ہتھیار ہے۔ اس معاملہ میں مجھے کوئی شک نہیں ہے۔

یہ دیکھ کر اس سمجھدار سیکرٹری نے سر ہلا کر کہا ''دیکھا جائے گا۔''

☆☆☆

باب نمبر ۴۸

شانتی نکتین

راج کوٹ کے بعد میں شانتی نکتین پہنچا۔ وہاں کے پروفیسر اور طالب علم میرے ساتھ بڑی محبت سے پیش آئے۔ نہایت سادگی سے استقبال کیا گیا۔ جس میں صنعت لطیفہ اور محبت مدغم تھی۔ وہاں کاکا کالیکر سے میری پہلی بار ملاقات ہوئی۔

شانتی نکتین میں میرے ساتھیوں کو علیٰحدہ جگہ ٹھہرایا گیا۔ مگن لعل گاندھی ان لوگوں کی نگہداشت کرتے تھے اور فینکس آشرم کے اصولوں پر بڑی احتیاط سے عمل کرایا جاتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ انہوں نے شانتی نکتین میں اپنی محبت، لگن اور دلچسپی کی دھاک پھیلا دی۔ وہاں اینڈریوز اور پیرسن بھی اس وقت موجود تھے۔

اپنی عادت کے مطابق میں پروفیسروں اور طالب علموں سے مل جل گیا اور جسمانی مشقت کے کاموں میں دلچسپی کا اظہار کرنے لگ گیا۔ خود کھانا بناتا اور برتن صاف کرتا تھا۔ اس کے علاوہ بنگالی کھانے میں اصلاح کے خیال سے ایک چھوٹی رسوئی الگ کرلی تھی۔

میرا ارادہ کچھ دن شانتی نکتین میں رہنے کا تھا۔ مگر قدرت زبردستی مجھے وہاں سے گھسیٹ لے گئی۔ ایک ہفتہ ہی رہا تھا کہ پونا سے گوکھلے کے سورگ سدھارنے کی خبر ملی۔ سارا شانتی نکتین غم میں ڈوب گیا۔ تمام لوگ میرے پاس ماتم پرسی کے لیے آئے اور میں اسی دن پونا روانہ ہوگیا۔ مگن لعل اور استری ساتھ تھے اور باقی لوگ وہاں ہی رہے۔

اینڈریوز بردوان تک میرے ساتھ آئے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا ''کیا آپ کو محسوس ہو رہا کہ ہندوستان میں بھی ستیہ آگرہ کا وقت آئے گا؟''

"اگر یہ خیال ہے تو کب تک امید ہے؟"

میں نے جواب دیا "یہ کہنا تو مشکل ہے مگر ابھی ایک سال بھر تو میں کچھ کرنا نہیں چاہتا۔ مرحوم گوکھلے نے مجھے کہا تھا کہ ایک سال تک ابھی میں سارے ملک کا دورہ کروں اور کسی بھی معمولی مسئلہ پر اپنی رائے کا اظہار نہ کروں۔ میں ہر لحاظ سے اس بات پر عمل کرنا چاہتا ہوں اور اس کے بعد اس وقت تک کوئی بات منہ سے نہیں نکالوں گا جب تک کسی سوال پر کچھ کہنے کی ضرورت لاحق نہیں ہوگی۔ اس لیے میں یہ کہہ نہیں سکتا کہ آئندہ پانچ سالوں میں ستیہ آگرہ کا کوئی موقعہ ہاتھ آئے گا یا نہیں۔"

یہاں یہ تحریر کردینا لازم ہے کہ "ہندوستانی سوراجیہ" نامی کتاب میں میں نے جو خیالات ظاہر کیے ہیں۔ گوکھلے انہیں سن کر مسکرائے اور گویا ہوئے کہ ایک سال تک ہندوستان میں رہنے کے بعد پتہ چلے گا کہ کس طرح تمہارے خیالات سرد پڑ جاتے ہیں۔

☆☆☆

باب نمبر ۴۹

تیسرے درجہ کی مصیبت

بردوان پہنچ کر ہم تیسرے درجہ کا ٹکٹ کٹوانا چاہتے تھے لیکن ٹکٹ لینے میں سخت مصیبت پیش آئی۔ ٹکٹ لینے کے لیے پہنچا تو جواب ملا۔ تیسرے درجہ کے مسافروں کو پہلے ٹکٹ نہیں دیا جاتا۔

یہ سن کر میں سٹیشن ماسٹر صاحب کے پاس پہنچا۔ مجھے بھلا وہاں کون جانے دیتا؟ کسی نے نوازش کر کے بتایا کہ سٹیشن ماسٹر وہاں ہے۔ جب میں ان کے پاس پہنچا تو وہاں سے بھی یہی جواب ملا۔ کھڑکی کھلنے پر ٹکٹ لینے گیا لیکن ٹکٹ لینا آسان نہیں تھا۔ ٹیکا شد۔ مسافر میرے جیسے کمزور آدمیوں کو دھکیل کر آگے بڑھ جاتے۔ بڑی مشکل سے آخر کار ٹکٹ مل گیا۔

گاڑی آئی تو اس میں بھی جو زبردست لوگ تھے چڑھ گئے۔ اترنے والوں میں اور سوار ہونے والوں میں دھکم دھکا ہونے لگا۔ اس اودھم میں بھلا میں کس طرح شریک ہوسکتا تھا؟ اس لیے ہم تینوں ایک کھڑکی سے دوسری تک جاتے مگر ہر ایک جگہ سے یہی جواب ملتا۔ یہاں جگہ نہیں ہے۔ یہ دیکھ کر میں گارڈ کے پاس پہنچا۔ اس نے جواب دیا۔ جگہ ملے تو بیٹھ جاؤ نہیں تو دوسری گاڑی سے چلے جانا۔ میں نے نرم لہجہ میں جواب دیا۔ مجھے تو ضروری کام ہے مگر گارڈ کو یہ سننے کی فرصت نہیں تھی۔ اب میں ہر پہلو سے نادم ہوگیا اور نگن لال سے کہا۔ جہاں جگہ مل جائے بیٹھ جاؤ اور میں استری کو لے کر تیسرے درجہ کی بجائے انٹر کلاس میں پہنچا۔ گارڈ نے مجھے اس ڈبہ میں جاتے دیکھ لیا۔

سنسول سٹیشن پر گارڈ ڈیوڑھا کرایہ وصول کرنے آ پہنچا۔

میں نے کہا ''آپ کا فرض تھا کہ آپ مجھے جگہ بتاتے۔ چونکہ تیسرے درجہ میں جگہ نہیں ملی۔ اس لیے یہاں بیٹھا ہوں اگر تیسرے درجہ میں جگہ بتائیں تو وہاں جانے کے لیے تیار ہوں۔''

گارڈ صاحب بولے۔ میرے ساتھ بحث نہ کرو۔ میرے پاس جگہ نہیں ہے۔ کرایہ ادا نہیں کرو گے تو تمہیں گاڑی سے اترنا پڑے گا۔ مگر مجھے تو جلد پونا پہنچنا تھا۔ گارڈ کے ساتھ لڑائی کا وقت ہی نہیں تھا۔ لاچار ہو کر کرایہ ادا کر دیا۔ اس نے پونا تک کا ڈیوڑھا کرایہ وصول کر لیا۔ مگر مجھے یہ بے انصافی نہایت بری معلوم ہوئی۔

صبح کے وقت مغل سرائے پہنچے۔ مگن لعل کو تیسرے درجہ میں جگہ مل گئی تھی۔ وہاں پہنچ کر میں نے ٹکٹ کلکٹر کو ساری کیفیت بتائی اور میں نے اس سے اس امر کی شکایت کی۔ مگر اس نے انکار کر ڈالا۔ ریلوے کے بڑے افسر کو زیادہ کرایہ وصول کرنے کی درخواست دی مگر اس کا اس قسم کا جواب ملا۔ ثبوت کے بغیر زیادہ کرایہ کی رقم واپس کرنے کا ہمارا رواج نہیں ہے لیکن چونکہ یہ آپ کا معاملہ ہے اس لیے واپس کر دیتے ہیں۔ بردوان سے مغل سرائے تک کا زاید کرایہ واپس نہیں دیا جا سکتا۔

اس کے بعد تیسرے درجہ کے سفر کے اتنے تجربے ہوئے کہ ان کی ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے مگر ان کا اس کتاب میں ذکر نہیں ہو سکتا۔ طبیعت کی غیر مناسبت کی وجہ سے میرا تیسرے درجہ کا سفر بند ہو گیا۔ مگر مجھے یہ ہمیشہ کھٹکتا رہا۔ تیسرے درجہ میں مسافروں کی جہالت گندگی اور خود غرضی کا کچھ تجربہ نہیں ہوا۔ افسوس تو یہ ہے کہ کئی بار مسافر جان بوجھ کر بھی جہالت کا ثبوت دینے لگ جاتے ہیں۔ جو کچھ وہ کرتے ہیں انہیں طبعی معلوم ہوتا ہے لیکن دوسری طرف ہم ہیں جو مصلح کہے جاتے ہیں۔ جن کی پرواہ ہی نہیں کی جاتی۔

کسی طرح تھکے ماندے ہم کلیان جنکشن پر پہنچ گئے اور نہانے کی تیاری کی۔ مگن لعل اور میں نل سے پانی لے کر نہائے۔ ابھی استری کے لیے میں کوئی تجویز کر رہا تھا کہ اتنے میں سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے آدمی ہماری تلاش میں آ پہنچے۔ وہ بھی پونا جا رہے تھے۔ انہوں نے میری استری کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ان کو نہانے کے لیے دوسرے درجہ کے

کمپارٹمنٹ میں لے جانا چاہیے۔ ان کے اس مشورہ پر عمل کرنے میں مجھے شرم محسوس ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ اسے دوسرے درجہ کے کمرہ سے فائدہ حاصل کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ مگر میں نے اس کی غیر سبت کا خیال نہ کیا۔ سچائی کے گرویدہ کو اس قسم کی خلاف ورزی اچھی نہیں لگتی اور میری استری یہ نہیں چاہتی تھی کہ میں وہاں جا کر نہاؤں۔ مگر پتی کی محبت کے طلا کار الفاظ نے حقیقت کو ملمع سے ڈھک لیا۔

☆☆☆

باب نمبر ۵۰

میری کوشش

پونا پہنچ کر "اتر کریا" وغیرہ سے فراغت کے بعد ہم سب یہ سوچنے لگے کہ سوسائٹی کا کام کس طرح چلایا جائے اور میں اس کا ممبر بنوں یا نہ بنوں۔ اس وقت مجھ پر کافی بوجھ تھا۔ گوکھلے کی زندگی میں مجھے ممبر بننے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں تو صرف گوکھلے کی مرضی اور حکم کے ماتحت رہنا چاہتا تھا۔ مجھے یہ پسند بھی تھا کیونکہ ہندوستان کے اتنے بڑے طوفانی سمندر میں کودنے کے لیے تجربہ کار ملاح کی ضرورت تھی اور گوکھلے جیسے ناخدا کے آسرا میں میں اپنے آپ کو محفوظ خیال کرتا تھا۔

اب میرا جی کہنے لگا کہ مجھے سوسائٹی میں داخل ہونے کے لیے ضرور کوشش کرنی چاہیے۔ میں نے سوچا کہ گوکھلے کی روح کہتی تھی کہ میں نے بلا جھجک کوشش شروع کی تھی اس وقت سائٹی کے تمام ممبر وہاں موجود تھے۔ میں نے انہیں سمجھایا اور میری نسبت جو خوف ان کے اذہان پر مسلط تھا۔ اسے دور کرنے کی زبردست کوشش کی لیکن میں نے دیکھا کہ اراکین میں اس بات پر اختلاف رائے تھا۔ چند ممبران کی رائے تھی کہ مجھے سوسائٹی میں شامل کر لیا جائے۔ مگر کئی سخت مخالف تھے۔ تاہم دونوں خیالات کے لوگ میرے ساتھ محبت کرتے تھے۔

اسی لیے ہماری گفتگو میں ایک قسم کی شرینی پائی جاتی تھی جو لوگ میری مخالفت کر رہے تھے۔ انہیں خیال آیا کہ کئی باتوں میں ان کے اور میرے خیالات میں زمین اور آسمان کا فرق ہے اور اس سے بھی بڑھ کر انہوں نے یہ سوچا کہ جن مقاصد کے پیش نظر گوکھلے مرحوم نے یہ جماعت بنائی تھی۔ میرے شامل ہو جانے پر معاملہ برعکس ہو جائے گا۔ انہیں یہ بات

ناقابلِ برداشت محسوس ہوئی۔ کافی بحث مباحثہ کے بعد ہم گھر واپس آئے اور اراکین نے آخری فیصلہ سوسائٹی کی اگلی میٹنگ کے لیے ملتوی کر دیا۔

گھر واپس جاتے ہوئے میں بڑا متفکر تھا۔ کیا کثرت رائے سے میرا سوسائٹی میں شامل ہونا مناسب ہے؟ اور کیا میں اس طرح گوکھلے کی وفاداری کا ثبوت مہیا کر سکوں گا؟ اور اگر اکثریت میرے خلاف ہوئی تو اس سے سوسائٹی کے حالات کو خراب کرنے کا مرتکب تو نہیں بن جاؤں گا۔ مجھے یہ صاف نظر آیا کہ جب تک سوسائٹی کے اراکین میں میرے ممبر بنائے جانے کے لیے اختلاف رائے موجود ہے۔ اس وقت تک مجھے ان میں شامل ہونے کی تاکید سے منہ موڑ لینا چاہیے۔ میں نے اسی خیال میں بہتری سمجھی جب یہ فیصلہ کر لیا تو فوراً شری شاستری جی کو ایک خط لکھا کہ آپ مجھے ممبر بنانے کے لیے میٹنگ نہ بلائیں۔ مخالفین کو میرا یہ فیصلہ بڑا پسند آیا اور وہ تکلیف ذہنی سے بچ گئے اور ان کی میرے ساتھ گہری محبت ہو گئی اور اس طریقہ سے میری درخواست واپس ہو گئی۔ مگر میں سوسائٹی کا سچا کن بن گیا۔

اب تجربہ کے بعد میں دیکھتا ہوں کہ میرا یہ عمل بالکل درست رہا اور تمام اراکین نے میرے ممبر بننے کی جو مخالفت کی تھی وہ حقیقت نفس الامر سے تعلق رکھتی تھی اور تجربات نے بتایا کہ ان کے اور میرے معتقدات میں کافی فرق تھا لیکن فرق جاننے کے بعد بھی ہم لوگوں کے دلوں میں کبھی تضاد پیدا نہیں ہوا اس کے باوجود ہم دوست اور رفیق ہیں اور سوسائٹی کی جگہ میرے لیے زیارت گاہ بن گئی۔ بظاہر اگرچہ میں ان کا ممبر نہ بنا مگر باطن میں ان کا رکن ہوں۔ ظاہری تعلقات کی بجائے باطنی تعلقات زیادہ بہتر ہوا کرتے ہیں اور اس کے برعکس ظاہری تعلق تو بے روح جسد کی مانند ہوا کرتا ہے۔

☆☆☆

باب نمبر ۵۱

آشرم کا قیام

ستیہ آگرہ آشرم کا قیام ۱۵/ مئی ۱۹۱۵ء کو ہوا۔ سوامی شردھانند جی کی یہ رائے تھی کہ میں ہردوار ہی میں اقامت اختیار کروں۔ کلکتہ کے چند دوستوں کی رائے تھی کہ وئید ناتھ دھام میں ڈیرا لگاؤں اور کچھ دوست اس بات پر زور دے رہے تھے کہ راج کوٹ میں رہوں۔

مگر جب میں احمد آباد سے گزرا تو کئی دوستوں نے کہا کہ آپ احمد آباد کو منتخب کریں۔ انہوں نے آشرم کے خرچ کا بار بھی اپنے ذمہ لیا اور مکان کی تلاش کا بھی وعدہ کیا۔ اس لیے احمد آباد پر میرا خیال مرکوز ہو گیا۔ میں مانتا تھا کہ گجراتی ہونے کی وجہ سے میں گجراتی زبان کے ذریعہ قوم کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکوں گا۔ احمد آباد کپڑے کی دستکاری کا بڑا مرکز تھا۔ اس لیے یہاں چرخہ کا کام اچھی طرح ہو سکے گا اور گجرات کا بڑا شہر ہونے کی وجہ سے یہاں کے امیر لوگ روپیہ کے ذریعہ زیادہ مدد دے سکیں گے۔

احمد آباد کے دوستوں کے ساتھ جب آشرم کے متعلق بات چیت شروع ہوئی تو چھوت چھات کا بھی ذکر چھڑا۔ میں نے کھلے الفاظ میں کہا تھا کہ اگر کوئی قابل اچھوت بھائی آشرم میں داخل ہونا چاہیں گے تو میں انہیں آشرم میں رکھ لوں گا۔

ایک ویشنو دوست نے مندرجہ ذیل جواب دے کر دل کو تسلی دی۔ آپ کی شرائط پر عمل کرنے والے اچھوت بھلا کہیں راستہ میں تو نہیں پڑے؟

مگر آخر کار احمد آباد میں ہی آشرم بنانے کا فیصلہ ہو گیا اور ہم مکان تلاش کرنے

لگے۔ شری جیون لال بیرسٹر کا مکان جو کوچرب میں ہے کرایہ پر لینا طے پایا۔ وہ مجھے احمد آباد میں اقامت گزین کرنے والوں میں سب سے مقدم تھے۔

اس کے بعد آشرم کا نام رکھنے کی باری آئی۔ دوستوں سے مشورہ کیا۔ سیوا آشرم اور تپوبن وغیرہ نام بتائے گئے۔ شیوا آشرم نام ہمیں پسند آتا تھا لیکن اس سے سیوا کی غایت آشکار نہیں ہوتی تھی۔ اور تپوبن نام کیسے منظور ہو سکتا تھا؟ اگرچہ ہمیں ریاضت محبوب خاطر تھی۔ مگر اس کے باوجود وہ نام ہمیں اچھا معلوم نہ ہوا۔ ہمارا مقصد تو تھا سچائی کی پوجا اور سچائی کے لیے ''آگرہ'' جنوبی افریقہ میں میں نے جو تجربہ کیا تھا۔ اس کا تعارف ہندوستانیوں نے کیا تھا مگر ہمیں یہ بھی دیکھنا تھا کہ ہمارے تجربہ کا اثر اور قوت کہاں تک کام دے سکتی ہے۔ اس لیے میں نے اور میرے ساتھیوں نے ''ستیہ آگرہ آشرم'' نام پسند کیا اور اس میں سیوا اور سیوا کی غایت دونوں پہلو کارفرما تھے۔

آشرم کو چلانے کے لیے اصول و قواعد کی ضرورت تھی۔ اس لیے اصول و قواعد بنا کر اس کے متعلق کئی لوگوں سے رائیں طلب کی گئیں۔ تمام رائیوں سے مجھے سرگورو داس بینر جی کی رائے زیادہ یاد رہ گئی ہے۔ ان کے اصول و قواعد پسند آئے کیونکہ انہوں نے بتایا کہ میرے برتوں میں علم کر بتوں پر ضرور عمل کرنا چاہیے۔ ان کے خط سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ ہمارے نوجوانوں میں علم کارفرما نہیں ہے۔ میں بھی نرم دلی کو ہر جگہ محسوس کرتا تھا۔ مگر برت میں جگہ دینے سے نرمی' نرمی نہیں رہتی۔ یہ خیال تھا۔ نرمی کا مطلب تو ہے حس و حرکت سے عاری ہونا۔ اس کے لیے دوسرے برت موجود ہیں اور یہی تو مکتی کی حالت ہے۔ نجات حاصل کرنے والے یا سیوادار کے ہر ایک کام میں اگر نرمی اور غرور کا اندفاع نہ پایا جائے تو وہ سالک نہیں بن سکتا۔ سیوک نہیں بلکہ خود غرض اور مغرور کہا جائے گا۔

آشرم میں اس وقت تقریباً تیرہ آدمی شامل تھے۔ میرے ہمراہ جنوبی افریقہ سے پانچ تامل بچے آئے تھے اور یہاں کے قریباً ۲۵ آدمی ملا کر آشرم جاری کیا گیا۔ تمام لوگ ایک ہی جگہ کھانا کھاتے اور اس طرح رہنے کی کوشش کرتے جس طرح ایک ہی قبیلہ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔

☆☆☆

باب نمبر۵۲

کسوٹی

آشرم کے قیام کو ابھی چند ماہ ہی گزرے تھے کہ اتنے میں ہمارا ایسا امتحان ہوا جس کی امید تک نہیں تھی۔ ایک دن مجھے بھائی امرت لعل ٹھاکر کا خط ملا کہ ایک غریب اچھوت گھرانا آپ کے آشرم میں رہنے کا خواہش مند ہے۔ کیا آپ اسے اپنے پاس رکھیں گے؟

چٹھی پڑھ کر میں چونک اٹھا کیونکہ مجھے یہ یقین تھا کہ ٹھاکر بابا جیسے لوگ اتنا جلد اچھوت کی سفارش لے کر نہیں آئیں گے۔ میں نے اپنے رفیقوں کو وہ چٹھی دکھائی۔ ان لوگوں نے لبیک کہی اور میں نے بھائی امرت لعل کو جواب لکھا کہ اگر وہ گھرانا آشرم کے نیموں پر عمل کرے گا تو ہم اسے لینے کے لیے تیار ہیں۔

آخرکار دودھا بھائی ان کی استری' دانی بہنیں اور دودھ موہی لکشمی آشرم میں آئے۔ دودھا بھائی بمبئی میں مدرس تھے۔ وہ آشرم کے نیموں پر عمل کرنے کے لیے تیار تھے۔ اس لیے وہ آشرم میں لے لئے گئے۔

مگر اس سے میرے مددگار دوستوں اور رفیقوں میں خوب ہلچل مچی جس کنوئیں میں بنگلے کے مالک کا حصہ تھا۔ اس سے پانی بھرنے میں دقت آنے لگی کیونکہ کنواں ہانکنے والوں پر بھی ہمارے پانی کے چھینٹے پڑ جاتے تھے اور انہیں چھوت لگ جاتی تھی۔ انہوں نے ہمیں گالیاں دینی شروع کر دیں اور وہ دودھا بھائی کو بھی تنگ کرنے لگے۔ میں نے سب کو گالیاں برداشت کرنے کا مشورہ دیا اور پانی بھرنے کی ہدایت کی۔ ہمیں گالیوں کے جواب میں خاموش دیکھ کر کنواں ہانکنے والا سخت نادم ہوا۔ اس نے ہمارا پیچھا چھوڑ دیا مگر اس طرح

مالی امداد بند ہوگئی۔ جن بھائیوں نے پہلے ہی ان اچھوتوں کے داخل ہونے اور آشرم کے نیموں پر عمل کرنے پر اعتراض کیا تھا۔ انہیں کوئی امید ہی نہیں تھا کہ آشرم میں کوئی اچھوت آ جائے گا۔ دوسری طرف مالی امداد بند ہوگئی اور ہمارے بائیکاٹ کی افواہ سننے میں آئی۔ میں نے ساتھیوں کے ساتھ یہ طے کر رکھا تھا کہ اگر ہمارا بائیکاٹ ہوگیا اور ہمیں کہیں سے بھی مدد نہ ملی تو بھی ہمیں احمد آباد نہیں چھوڑنا چاہیے۔ ہم اچھوتوں کے محلہ میں جا کر آباد ہو جائیں گے اور جو کچھ ملے گا اس پر یا مزدوری پر گذارہ کر لیں گے۔

آخرکار ایک دن مگن لعل نے مجھے نوٹس دیا کہ اگلے ماہ تک آشرم کے اخراجات کے لیے ہمارے پاس کوئی روپیہ نہیں ہے۔ مگر میں نے صبر سے جواب دیا کہ ہم اچھوتوں کے محلہ میں جا کر آباد ہو جائیں گے۔

مجھے یہ تکلیف پہلی بار ہی پیش نہیں آئی تھی۔ ہر دفعہ آخری موقعہ پر اس رزاق نے کہیں نہ کہیں سے ہماری مدد کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

مگن لعل کے نوٹس کے چند یوم بعد ہی ایک دن صبح کے وقت کسی بچہ نے آ کر خبر دی کہ باہر ایک موٹر کھڑی ہے۔ ایک سیٹھ آپ کو بلا رہے ہیں۔ میں موٹر کے پاس پہنچا۔ تو سیٹھ نے مجھے کہا۔ "میں آشرم کو کچھ مدد دینا چاہتا ہوں کیا آپ لے لیں گے؟"

میں نے جواب دیا "اگر دینا چاہیں تو میں ضرور لے لوں گا۔ کیونکہ اس وقت مجھے ضرورت بھی ہے۔"

وہ بولے "میں کل اسی وقت یہاں آؤں گا۔ کیا آپ آشرم میں ہی ملیں گے؟"

میں نے "ہاں" کہی اور سیٹھ جی اپنے گھر واپس چلے گئے۔ دوسرے دن مقررہ وقت پر موٹر کا بھونپو بجا اور لڑکے نے مجھے آ کر بتایا مگر وہ سیٹھ اندر نہیں آئے۔ میں ہی انہیں ملنے کے لیے گیا۔ میرے ہاتھوں میں تیرہ ہزار کے نوٹ رکھ کر وہ چلا گیا۔ مجھے اس مدد کی بالکل امید ہی نہیں تھی۔ اور مدد کرنے کا یہ طریقہ بھی نیا تھا۔ انہوں نے اس سے پہلے آشرم میں کبھی قدم نہیں رکھا تھا۔ مجھے ایسا یاد آتا ہے کہ ایک بار پہلے بھی میں انہیں ملا تھا۔ نہ تو وہ آشرم میں آئے اور نہ انہوں نے کچھ دریافت کیا۔ باہر سے ہی روپیہ دے کر چلے گئے۔ میرا یہ پہلا تجربہ تھا۔ اس مدد کے ملتے ہی اچھوتوں کے محلّہ میں جانے کا خیال ترک کر دیا گیا۔

کیونکہ ایک برس کے لگ بھگ خرچ ہے تو بے فکر ہو گیا تھا۔

مگر باہر کی طرح آشرم میں بھی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ اگرچہ جنوبی افریقہ میں اچھوت میرے پاس آیا کرتے تھے اور کھانا بھی کھاتے تھے مگر یہاں اچھوت قبیلہ کی آمد اور رہائش میری استری اور دوسری عورتوں کو پسند نہ آئی۔ دانی بہن سے اگرچہ وہ نفرت نہیں کرتی تھیں مگر مجھے اپنی آنکھوں اور کانوں سے یہ محسوس ہوتا تھا۔ جس طرح نفرت غالب آنے کے لیے کارفرما ہو رہی ہے۔ مالی مشکلات کی وجہ سے نہ تو میں مایوس ہوتا تھا اور نہ فکر مند رہتا۔ مگر یہ دلی خلفشار ناقابلِ برداشت تھا۔ دانی بہن معمولی عورت تھی اور دودھا بائی کی تعلیم بھی کم ہی تھی۔ مگر وہ زیادہ سمجھدار تھے۔ ان کی زندگی مجھے پسند خاطر تھی۔ کبھی کبھی انہیں غصہ آ جاتا تھا مگر عموماً ان کی بردباری کا اثر مجھ پر غالب رہا۔ معمولی باتوں کا ہمیں بالکل خیال نہیں کرنا چاہیے۔ وہ کافی سمجھدار تھے اور دانی بہن کو بھی برداشت کرنے کی ہدایت کیا کرتے تھے۔

اس قبیلہ کو آشرم میں رکھ کر آشرم نے بڑا سبق حاصل کیا اور آغاز میں ہی اس امر کا آشکارا ہو جانے سے کہ آشرم میں چھوا چھوت نہیں چل سکتی آشرم کا اصول قائم ہو گیا تھا اور اس کا کام بڑا سادہ بن گیا تھا۔ مگر اس کے باوجود آشرم کا خرچ بڑھنے پر بھی زیادہ تر ان ہندوؤں کی طرف سے امداد ملتی آ رہی تھی۔ یہ بات اس امر کو اچھی طرح واضح کرتی ہے کہ چھوا چھوت کی بنیاد اچھی طرح متزلزل ہو چکی ہے۔

☆☆☆

باب نمبر ۵۳

گرمٹیا رواج

اب ہم نئے آباد کردہ آشرم کو چھوڑ کر جو کہ اس وقت تک ہر قسم کے خطرات سے محفوظ ہو چکا تھا۔ اب گرمٹیا رواج یا قلی پن پر ذرا غور کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ گرمٹیا اس قلی یا مزدور کو کہتے ہیں جو پانچ سال یا اس سے کم عرصہ کے لیے مزدوری کا اقرار نامہ لکھ کر ہندوستان سے باہر چلا جاتا ہے۔ نٹال میں ایسے گرمٹیا لوگوں سے ۱۹۱۴ء میں تین پونڈ سالانہ ٹیکس دور کر دیا گیا تھا۔ مگر اس کا رواج ابھی جاری تھا۔ ۱۹۱۶ء میں بھارت بھوشن پنڈت مدن موہن مالویہ جی نے اس سوال کو سنٹرل اسمبلی میں پیش کیا اور لارڈ ہارڈنگ نے ان کی تجویز کو منظور کر کے یہ اعلان کیا تھا کہ اس ٹیکس کو ضرورت پڑتے ہی ہٹانے کا اقرار مجھے شہنشاہ کی طرف سے ملا ہے لیکن میری تو یہ کھلی رائے تھی کہ اس رسم کو فی الفور بند کرنے کا فیصلہ ہو جانا چاہیے۔ ہندوستان اپنی لاپروائی کی وجہ سے کافی درگزر کرتا رہا ہے۔ مگر اب میں نے یہ دیکھا کہ لوگوں میں اس حد تک بیداری آ گئی ہے کہ اس ٹیکس کو اب بند کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے میں کئی لیڈروں سے صرف اسی بات کے لیے ملاقاتی ہوا' اخبارات میں مضامین تحریر کیے تو یہ معلوم ہوا کہ عوام اس ٹیکس کو کالعدم کر دینے کے درپے ہیں۔ اس حالت میں خود بخود جی میں سوال پیدا ہوا کہ کیا اس کے لیے ستیہ آگرہ کو استعمال میں لایا جا سکتا ہے؟ مجھے اپنے تجربہ پر تو کوئی شک نہیں تھا مگر مجھے یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ تجربہ کو کس طرح عمل میں لایا جائے۔

اسی اثنا میں وائسرائے نے وقت آنے پر ان الفاظ کو اچھی طرح واضح کر دیا اور

بتایا کہ آئین کی تبدیلی میں کتنا خرچ ہوگا۔ اس عرصہ میں اس رواج کو دور کر دیا جائے گا۔ یہ دیکھ کر پنڈت مدن موہن جی مالویہ نے فروری ۱۹۱۷ء میں گرمٹیا رسم کو قطعاً دور کر دینے کے قانون کی اجازت سنٹرل اسمبلی سے مانگی تو وائسرائے نے اسے نامنظور کر دیا اس حالت میں یہ دیکھ کر میں نے اس سلسلہ میں ہندوستان کا دورہ شروع کیا۔

دورہ بمبئی سے شروع کیا۔ وہاں ایمپریل سٹی زن شپ ایسوی ایشن کے نام پر جلسہ ہوا۔ اس میں جو ریزولیوشن پیش ہونے والے تھے۔ ان کا مسورہ تیار کرنے کے لیے ایک سب کمیٹی بنائی گئی اور ایک تجویز کے ذریعہ استدعا کی گئی تھی کہ گرمٹیا رسم بند کر ڈالی جائے۔ مگر سوال یہ درپیش تھا کہ اس رواج کو کس طرح بند کیا جائے؟ اس سلسلہ میں تین شقیں پیش کی گئیں۔

۱۔ جس قدر جلد ہو سکے۔

۲۔ ۳۱ جولائی اور

۳۔ فی الفور

ان میں ۳۱ جولائی والا مطالبہ میرا تھا۔ مجھے تو مقررہ تاریخ کی احتیاج تھی۔ تا کہ اس معیاد تک اگر کچھ نہ ہو تو اس بات کا پتہ چل سکے کہ اس سے آگے کیا کرنا ہے اور کیا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن للو بھائی کی رائے تھی کہ فی الفور لفظ تجویز میں رکھا جائے۔ انہوں نے کہا کہ ۳۱ جولائی کے فی الفور لفظ سے زیادہ جلدی کا مطلب واضح ہوتا ہے۔ اس صورت میں میں نے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ لوگوں کو فی الفور کے مطلب کا پتہ نہیں چلے گا۔ اگر لوگوں سے کچھ کام لینا ہو تو ان کے سامنے یقینی لفظ کا پیش کیا جانا ضروری ہے۔ فی الفور کو ہر ایک شخص اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکتا ہے۔ سرکار کچھ لے سکتی ہے' لوگ کچھ سمجھ سکتے ہیں۔ مگر ۳۱ جولائی کے سب یکساں معنی لیں گے۔ اور اگر اس تاریخ تک کوئی فیصلہ نہ ہوا تو ہم یہ سوچ سکتے ہیں کہ اب ہمیں کیا کارروائی کرنی چاہیے۔ یہ دلیل ڈاکٹر ریڈ کو اسی وقت جچ گئی اور آخر کار سر للو بھائی کو بھی ۳۱ جولائی کی تجویز اچھی لگی اور تجویز میں وہی تاریخ لکھی گئی۔ پھر سبھا میں یہ تجویز رکھی گئی اور ہر جگہ ۳۱ جولائی کی معیاد کو مشتہر کیا گیا۔

اس وقت تک میں اکیلا ہی سفر کیا کرتا تھا۔ سفر میں بڑے عجیب و غریب تجربے

پیش آتے تھے۔ خفیہ پولیس پیچھے لگی رہتی تھی مگر اس سے تکرار کی مجھے کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میرے پاس کوئی در پردہ بات نہ تھی۔ اس لیے وہ نہ مجھے ستاتے اور نہ میں انہیں تنگ کرتا تھا۔ اچانک اس زمانہ پر مجھ پر مہاتما کی چھاپ لگ گئی۔ جہاں بھی لوگ مجھے پہچان جاتے اسی نام سے مخاطب کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ریل کے سفر میں جاتے ہوئے کئی سٹیشنوں پر خفیہ پولیس کے لوگ میرا ٹکٹ دیکھنے آتے اور نمبر وغیرہ نوٹ کر لیا کرتے تھے۔ میں ان کے ہر ایک سوال کا فوراً جواب دے دیا کرتا تھا۔ یہ دیکھ کر میرے ساتھی مسافروں نے سمجھا کہ میں کوئی سیدھا سادہ سادھو فقیر ہوں۔ جب دو چار سٹیشنوں پر خفیہ پولیس آئی تو وہ مسافر پھر بگڑ اٹھے اور پولیس والوں کو گالیاں دینے لگے۔ اس بچارے سادھو کو فضول کیوں دق کرتے ہو اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگے۔ ان بدمعاشوں کو ٹکٹ مت دکھائیو۔

میں نے اطمینان سے ان مسافروں سے کہا۔ انہیں ٹکٹ دکھانے سے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ وہ اپنا فرض ادا کرتے ہیں جس سے مجھے کسی قسم کا دکھ نہیں ہے۔

مگر ان مسافروں کو یہ بات پسند نہ آئی وہ مجھ پر زیادہ ترس کھانے لگے اور آپس میں باتیں کرنے لگے کہ دیکھو بے قصور لوگوں کو بھی یہ لوگ کس طرح پریشان کرتے ہیں۔

لاہور سے لے کر دہلی تک مجھے ریل کی بھیڑ اور تکلیف کا تلخ تجربہ ہوا۔ کراچی سے لاہور ہو کر مجھے کلکتہ جانا تھا۔ لاہور میں گاڑی بدلنی پڑتی تھی۔ مسافر زبردستی گھس آتے تھے۔ دوسری طرف مجھے مقررہ تاریخ پر کلکتہ پہنچنا تھا۔ اگر اس گاڑی سے رہ جاتا تو میں بروقت کلکتہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ میں جگہ ملنے کی امید چھوڑ رہا تھا۔ کوئی بھی مجھے اپنے ڈبہ میں سوار نہیں ہونے دیتا تھا۔ آخر کار مجھے جگہ کی تلاش کرتے دیکھ کر ایک مزدور نے کہا مجھے بارہ آنے دو تو میں جگہ دلا دوں گا۔ میں نے کہا اگر مجھے جگہ دلا دو تو میں ضرور بارہ آنے دوں گا۔ وہ مزدور بچارا مسافروں کی منت سماجت کرنے لگا مگر کوئی شخص مجھے جگہ دینے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ گاڑی چلنے والی تھی۔ اتنے میں ایک ڈبہ کے مسافر بولے۔ یہاں جگہ نہیں ہے لیکن اس میں آ سکتے ہو تو آ جاؤ۔ کھڑے رہنا پڑے گا۔ مزدور نے مجھ سے پوچھا۔

''کیوں جی؟'' میں نے کہا۔ ''ہاں چڑھا دو۔'' اس کے بعد اس مزدور نے مجھے اٹھا کر کھڑکی سے ڈبہ میں پھینک دیا۔ میں اندر پہنچا تو مزدور نے بارہ آنے کما لئے۔

یہ رات بڑی مشکل سے گزری۔ دوسرے مسافر تو جوں توں کر کے بیٹھ گئے۔ مگر میں اوپر کی زنجیر پکڑ کر کھڑا ہی رہا۔ کبھی کبھی مسافر لوگ مجھے ڈانٹتے۔ ارے کھڑا کیوں ہے بیٹھ کیوں نہیں جاتا؟ میں نے انہیں کافی سمجھایا کہ بیٹھنے کی جگہ ہی نہیں ہے۔ مگر وہ میرا کھڑے رہنا بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ حالانکہ وہ اوپر کے پھٹوں پر آرام سے پاؤں پسار کر پڑے مگر مجھے بار بار دق کرتے تھے۔ ان کے دق کرنے کے باوجود میں انہیں اطمینان سے سمجھاتا جس سے آخر کار وہ کہیں جا کر خاموش ہوئے اور میرا پتہ ٹھکانہ پوچھنے لگے۔ جب میں نے اپنا نام بتایا تو وہ سخت شرمندہ ہوئے اور معافی کے طلب گار ہوئے اور فوراً اپنے پاس جگہ بنا دی۔ ''صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔'' مجھے یہ کہاوت یاد آ گئی۔ اس وقت میں سخت تھک گیا تھا۔ سر چکرا رہا تھا۔ جب بیٹھنے کی جگہ کی درحقیقت ضرورت تھی۔ ایشور نے خود بخود اس کے لیے سہولت پیدا کر ڈالی۔

اس طرح دھکے کھاتے ہوئے آخر کار بروقت کلکتہ پہنچا۔ قاسم بازار کے مہاراجہ نے مجھے ٹھہرانے کی دعوت دی ہوئی تھی اور کلکتہ کے جلسہ کے صدر بھی وہی تھے۔ کراچی کی طرح یہاں بھی لوگوں میں جوش پیدا ہو گیا اور چند انگریز بھی آ گئے تھے۔

۳۱ جولائی سے قبل قلی پن کے رواج کو دور کرنے کے لیے میں پہلی درخواست بنائی تھی اور یہ امید تھی کہ کسی دن اس نیم غلامی کے رواج کو دور کر دیا جائے گا۔ ۱۸۹۴ء کے شروع کردہ اس کام میں اگرچہ کئی لوگوں کی مدد کا ہاتھ تھا مگر اس اظہار کے بغیر رہ نہیں سکتا کہ اس کوشش کے ساتھ حقیقی ستیہ آگرہ کا عمل بھی شامل تھا۔

☆☆☆

باب نمبر ۵۴

نیل کا داغ

چمپارن راجہ جنک کی سرزمین ہے جس طرح چمپارن میں آموں کے جنگل ہیں اسی طرح ۱۹۱۷ء میں نیل کے کھیت تھے۔ چمپارن کے کسان اپنی زمین کے ۳/۲۰ حصہ میں اصلی مالک کے لیے نیل کی کھیتی کرنے پر قانوناً مجبور تھے۔ اسے وہاں تین کٹھیا کہتے تھے۔ وہاں بیس کٹھے کا ایک ایکڑ ہوتا ہے۔ جس میں سے تین کٹھے نیل بنانا پڑتا تھا۔ اس لیے اس رسم کا نام تھا ''تین کٹھیا''۔

میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ چمپارن جانے سے پہلے میں اس جگہ کا نام ونشان تک نہیں جانتا تھا اور یہ خیال بھی عموماً نفی کے برابر تھا کہ وہاں نیل کی کھیتی ہوتی ہے۔ نیل کی گوٹیاں دیکھی تھیں مگر مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ وہ چمپارن میں بنتی تھیں اور اس کے لیے وہاں ہزاروں کسانوں کو تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔

راج کمار شکل نامی ایک کسان چمپارن میں رہتے تھے۔ ان پر نیل کی کھیتی کے سلسلہ میں کافی بری بیتی تھی۔ انہیں وہ دکھ ستا رہا تھا جس کے نتیجہ کے طور پر سب کے جی میں نیل کے داغ کو مٹا دینے کا خیال پیدا ہوا۔

جب میں لکھنؤ کانگرس میں گیا تو اس کسان نے میرا دامن پکڑ لیا اور کہا وکیل بابو آپ کو تمام حالات بتائیں گے۔ یہ کہتے ہوئے وہ چمپارن چلنے کی مجھے دعوت دیتا جاتا تھا۔

وہ وکیل بابو اور کوئی نہیں' میرے چمپارن کے مہربان رفیق بہار کے سیوا جیون کی روح برج کشور بابو ہی تھے۔ انہیں راج کمار شکل میرے ڈیرا پر لائے اور کالے رنگ کا اچکن

اور پتلون وغیرہ پہنے ہوئے تھے۔ میرے دل پر ان کا کوئی گہرا اثر نہ ہوا۔ میں نے خیال کیا کہ اس بھولے کسان کو لوٹنے والے یہ کوئی وکیل صاحب ہوں گے۔

میں نے ان سے چمپارن کی تھوڑی سی کتھا سن لی اور اپنے خیال کے مطابق جواب دیا۔ جب تک میں خود جا کر تمام حالات دیکھ نہ لوں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ آپ کانگرس میں اس معاملہ پر گفتگو کریں مگر اس وقت مجھے تو چھوڑ ہی دیجئے۔ راج کمار شکل تو چاہتے ہی تھے کہ کانگرس میں برج کشور بابو بولے چنانچہ ایک ہمدردی کا ریزولیوشن پاس ہوا۔

راج کمار شکل کو دیکھ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی تھی مگر اتنے پر بھی ان کی تسلی نہ ہوئی۔

وہ تو خود چمپارن کے کسانوں کی مصیبت دکھانا چاہتے تھے۔ میں نے کہا۔ میں اپنے دورہ میں چمپارن کو بھی شامل کر لیتا ہوں اور ایک دو دن وہاں رہوں گا۔ انہوں نے کہا ایک دن کافی ہوگا مگر میری طرف نظر بھر کر دیکھئے تو سہی۔

میں لکھنؤ سے کانپور گیا تھا۔ وہاں بھی دیکھا تو راج کمار شکل موجود تھے۔ وہ کہنے لگے۔ یہاں سے چمپارن قریب ہی ہے۔ ایک دن دے دیجئے۔

یہ کہہ کر میں وہاں جانے کے لیے اور بھی مجبور ہو گیا۔ ابھی تو مجھے معاف کیجئے۔ مگر میں یہ زبان دیتا ہوں کہ میں ضرور آؤں گا۔

جب آشرم پہنچا تو وہاں بھی راج کمار شکل میرے پیچھے پیچھے تھے اور کہنے لگے۔ اب تو دن مقرر کر دیجئے۔

میں نے کہا۔ اچھا فلاں تاریخ کو میں نے کلکتہ جانا ہے وہاں سے آ کر مجھے لے جانا۔

کہاں جانا' کیا کرنا' کیا دیکھنا مجھے اس بات کا کوئی پتہ ہی نہیں تھا۔ کلکتہ میں بھوپین بابو کے ہاں میرے پہنچنے سے قبل ہی راج کمار شکل پہنچ چکے تھے۔ اب تو ان پڑھ بے ڈھب لیکن پختہ اعتقاد والے کسان نے مجھے جیت لیا۔

۱۹۱۷ء کے آغاز میں ہم دونوں کلکتہ سے روانہ ہوئے۔ دونوں کی ایک ہی قسم کی جوڑی تھی۔ راج کمار شکل اور میں۔ ہم دونوں ایک ہی گاڑی میں سوار ہوئے اور صبح پٹنہ اترے۔

میرا پٹنہ کا یہ پہلا سفر تھا۔ میری وہاں اتنی بھی پہچان نہیں تھی کہ کس کے ہاں

ٹھہروں۔

میں نے جی میں سوچا کہ راج کمار شکل ہیں تو ان گھڑ کسان۔ مگر ان کی یہاں ضرور جانکاری ہوگی۔ ٹرین میں مجھے ان کے حالات سے قدرے جانکاری ہوئی اور پٹنہ میں جا کر قلعی کھل گئی۔ راج کمار شکل تو بچارے بے قصور تھے مگر جن وکلا کو انہوں نے دوست خیال کیا تھا وہ ان کے دوست نہیں بلکہ راج کمار شکل ایک طرح سے ان کے آسرے پر تھے۔ اس کسان موکل اور ان وکلا میں اتنا ہی فرق تھا جتنا برسات کے موسم میں گنگا جی کا پاٹ ہو جاتا ہے۔

وہاں مجھے راجیندر بابو کے ہاں لے گئے۔ راجیندر بابو پوری یا اور کسی جگہ گئے ہوئے تھے۔ بنگلے پر ایک دو نوکر تھے۔ کھانے کے لیے کچھ تو میرے پاس تھا۔ مگر مجھے کھجوروں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ وہ بچارے راج کمار شکل نے بازار سے لا دیں۔

مگر بہار میں چھوت چھات کا بڑا رواج تھا۔ میرے ڈول کے پانی کی چھینٹ سے نوکر کو چھوت لگتی تھی۔ نوکر بچارے کو کیا معلوم کہ میں کس ذات سے ہوں؟ اندر کے پاخانے کے استعمال کے لیے راج کمار نے کہا تو نوکر نے باہر کے پاخانے کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ میرے لیے اس میں کوئی حیرت نہیں تھی۔ کیونکہ میں ان باتوں کی وجہ سے پکا ہو چکا تھا۔ نوکر تو بچارا اپنے دھرم پر عمل کر رہا تھا اور راجیندر بابو کے متعلق اپنا فرض ادا کرتا تھا۔ ان تمام امور سے راج کمار بابو سے کسی حد تک میں متقرب ہو گیا۔ وہاں میں نے پٹنہ سے اپنی لگام اپنے آپ ہی سنبھال لی۔

☆☆☆

باب نمبر ۵۵

بیرونی سادگی

مولانا مظہر الحق اور میں مل کر لنڈن میں پڑھتے تھے کہ اس کے بعد ہم بمبئی میں ۱۹۱۵ء کی کانگرس میں ملے تھے۔ اس سال وہ مسلم لیگ کے صدر تھے۔ انہوں نے پرانی واقفیت جتا کر کہ جب کبھی پٹنہ آؤں اپنے ہاں ٹھہرنے کی دعوت دی تھی۔ اسی دعوت کی وجہ سے میں نے انہیں چٹھی لکھی اور اپنے کام کی نسبت بھی تحریر کیا۔ وہ فوراً اپنی موٹر لے کر آ پہنچے اور مجھے اپنے پاس چلنے کے لیے اصرار کرنے لگے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ مجھے اپنے مخصوص مقام پر پہلی ٹرین سے روانہ کر دیجیے۔ ریلوے گائیڈ سے مجھے مقام کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ انہوں نے اس کے بعد راج کمار شکل سے بات چیت کی اور کہا کہ پہلے مظفر پور جانا چاہیے۔ شام کو مظفر پور گاڑی جاتی تھی۔ چنانچہ اسی میں انہوں نے مجھے روانہ کر دیا۔

مظفر پور میں اس وقت آچاریہ کرپلانی رہتے تھے۔ میں انہیں پہچانتا تھا۔ جب میں حیدر آباد گیا تھا۔ تو ان کے زبردست تیاگ کی ان کی زندگی اور ان کے روپیہ سے چلنے والے آشرم کا ذکر ڈاکٹر چوئتھ رام سے سنا تھا۔ وہ مظفر پور کالج میں پروفیسر تھے۔ مگر اس وقت وہاں سے ریٹائر ہو گئے تھے۔ میں نے انہیں تار دیا۔ ٹرین آدھی رات کے وقت مظفر پور پہنچی اور وہ اپنے شاگردوں کو لے کر سٹیشن پر آ پہنچے مگر ان کا گھر بار کچھ نہیں تھا۔ وہ پروفیسر ملکانی کے ہاں رہتے تھے۔ مجھے ان کے ہاں لے گئے۔ ملکانی بھی وہاں کے کالج کے پروفیسر تھے۔ اس زمانہ میں گورنمنٹ کالج کے پروفیسر کا مجھے اپنے پاس ٹھہرانا غیر معمولی بات تھی۔

کرپلانی نے بہار کی اور بالخصوص کسانوں کی غربت کا ذکر کیا اور مجھے اپنے کام

کی مشکلات کا اندازہ بتایا۔ کرپلانی جی نے بہار کے لوگوں سے گہرا تعلق پیدا کیا ہوا تھا۔ انہوں نے میرے کام کا ذکر وہاں کے لوگوں سے کیا ہوا تھا۔ اس لیے صبح ہوتے ہی چند وکلا میرے پاس آ پہنچے۔

برج کشور بابو در بھنگا سے اور راجیندر بابو پوری سے آئے۔ یہاں جو میں نے دیکھا تو یہ لکھنؤ والے برج کشور پرساد نہیں تھے۔ ان میں بہاریوں کی سادگی نرمی اور سادہ روی اور عقیدت دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہوا تھا۔ ان کی نسبت بہاری وکلا کی وافر تر عقیدت دیکھ کر مجھے خوشی اور تعجب ہوا۔

اس وقت سے اس وکلا کی جماعت اور میرے درمیان زندگی بھر کے لیے محبت کی گرہ لگ گئی۔ برج کشور بابو نے مجھے تمام باتوں سے جانکار کر ڈالا۔ وہ غریب کسانوں کی طرف سے مقدمے لڑتے تھے۔ ایسے مقدمے اس وقت بھی چل رہے تھے۔ اس طرح وہ چند ایک افراد کو آرام پہنچاتے تھے۔ مگر کبھی کبھی اس کے باوجود بھی وہ ناکام رہتے تھے۔ ان بھولے بھالے کسانوں سے وہ فیس لیا کرتے تھے۔ تیاگی ہونے کے باوجود برج کشور بابو یا راجیندر بابو فیس لینے میں جھجکتے نہیں تھے۔ اگر پیشہ کے کام میں فیس نہ لیں تو ہمارا خرچ نہیں چل سکتا اور ہم لوگوں کی مدد بھی نہیں کر سکتے۔ یہ ان کی دلیل تھی۔ ان کی اور بنگال بہادر کے بیرسٹروں کی فیس کی رقم کو سن کر میں تو حیران رہ گیا۔

ہم نے اوپنین کے لیے دس ہزار روپے دیئے۔ یعنی ہزاروں سے کم کی تو میں نے بات تک نہیں سنی۔

ان دوستوں نے میرا میٹھا طعنہ بڑی محبت سے سنا۔ انہوں نے اس کے الٹے معنی نہیں لیے۔ میں نے کہا۔ ان مقدمات کی مثلوں کے دیکھنے کے بعد میری تو یہ رائے ہوتی ہے کہ ہم یہ مقدمہ بازی چھوڑ دیں۔ ان مقدمات سے بہت کم فائدہ رہتا ہے۔ ہاں رعایا کچلی جاتی ہے اور لوگ خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ وہاں عدالتوں سے بہت کم آرام حاصل ہوتا ہے لیکن اس کا حقیقی علاج یہی ہے کہ لوگوں کے ذہن سے خوف دور کر دیا جائے۔ اس لیے اب جب تک یہ تین کٹھیا کا رواج مٹ نہیں جاتا اس وقت تک ہم آرام نہیں کر سکتے۔ میں دو دن میں جو کچھ دیکھ سکتا ہوں دیکھنے آیا ہوں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ اس کام میں دو سال بھی

لگ سکتے ہیں۔ اگر اتنے عرصہ کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ مجھے یہ سوجھ رہا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ مگر آپ کی مدد بھی درکار ہوگی۔

میں نے دیکھا کہ برج کشور بابو پختہ خیال کے آدمی ہیں۔ انہوں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ہم سے جو کچھ ہو سکے گا۔ ہم ضرور مدد کریں گے۔ ہم اتنے لوگوں کے آپ جو کام سپرد کریں گے۔ وہ کرنے کے لیے تیار رہیں گے۔ اور ان میں سے آپ جتنے آدمیوں کو چاہیں گے آپ کے پاس حاضر رہیں گے۔ مگر جیل جانے کی بات اگرچہ ہمارے لیے نئی ہے لیکن اس کام کے لیے بھی ہم ہمت کرنے کی کوشش کریں گے۔

☆☆☆

باب نمبر ۵۶

اہنسا کا مظاہرہ

مجھے تو کسانوں کا امتحان لینا تھا۔ اور یہ دیکھنا تھا کہ نیل کے مالکوں سے کسانوں کی جو شکایت تھی۔ اس میں کتنی سچائی کارفرما ہے۔ اس لیے ہزاروں کسانوں سے ملنے کی ضرورت تھی لیکن اس طرح عام میل ملاپ سے پہلے مالکوں کی باتیں سن لینے اور کمشنر سے ملاقات کی ضرورت تھی۔ اس لیے میں نے دونوں کو چٹھیاں تحریر کیں۔

مالکوں کی جماعت کے سیکرٹری سے ملا۔ تو انہوں نے مجھے صاف کہہ دیا۔ آپ تو باہر کے آدمی ہیں آپ کو ہمارے اور کسانوں کے جھگڑے میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ مگر اس کے باوجود آپ کو کچھ کہنا ہو تو لکھ کر بھیج دیجئے۔ میں نے سیکرٹری سے ازراہ رفاقت کہا۔ میں اپنے آپ کو باہر کا آدمی خیال ہی نہیں کرتا اور اگر کسان چاہتے ہوں تو ان کے حالات کی جانکاری کا مجھے پورا پورا حق ہے۔

کمشنر صاحب سے ملا تو انہوں نے مجھے دھمکانے سے ابتدا کی اور اس سے آگے کوئی کارروائی نہ کر کے مجھے یہاں سے جانے کا مشورہ دیا۔

میں نے اپنے رفیقوں سے یہ باتیں کیں کہ ممکن ہے حکومت مجھے تفتیش کرنے سے منع کرے اور جیل کی نوبت میرے اندازہ سے پہلے ہی آ جائے اور اگر گرفتاری کی نوبت آ جائے تو مجھے موتی ہاری اور ہو سکے تو بیتیا میں گرفتار ہونا چاہیئے۔ اس لیے جتنا جلد ہو پائے مجھے وہاں پہنچ جانا چاہیے۔

ہم ابھی نصف راستہ پر ہی ہوں گے کہ پولیس سپرنٹنڈنٹ کا سپاہی آ پہنچا اور اس

نے مجھے کہا۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے آپ کو سلام بھیجا ہے۔ میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ میں نے دھرنی دھر بابو سے کہا۔ آپ آگے چلیں میں اس جاسوس کے ہمراہ اس گاڑی میں بیٹھا جو وہ کرایہ پر لایا تھا۔ اس نے مجھے چمپارن سے چلے جانے کا نوٹس دیا اور گھر لے جا کر اس پر میرے دستخط کرانے کے لیے کہا۔ میں نے جواب میں لکھ دیا کہ میں چمپارن سے جانا نہیں چاہتا۔ آگے مفصلات میں جا کر انکوائری کرنی ہے چنانچہ حکم عدولی کی وجہ سے دوسرے ہی دن مجھے عدالت میں حاضر ہونے کا سمن ملا۔

ساری رات بیدار رہ کر میں نے کئی جگہ چٹھیاں لکھیں اور جو جو ضروری امور تھے۔ وہ برج کشور بابو کو سمجھا دیئے۔

ساتھیوں سے مشورہ کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ کانگرس کے نام پر یہاں کوئی کام نہ کیا جائے۔ نام سے نہیں بلکہ ہمیں تو کام سے مطلب ہے۔ یہ بات کہنے کی نہیں کرنے کی ہے۔ یہاں کے لوگ کانگرس کے نام سے چڑتے ہیں۔

اس لیے کانگرس کی طرف بظاہر یا باطنی طور پر کوئی زمین تیار نہیں کرائی گئی تھی۔ اور نہ کوئی پیش بندی کی گئی تھی۔ راج کمار شکل میں ہزاروں لوگوں کے شامل کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ وہاں کے لوگوں نے ابھی تک کوئی سیاسی کام نہیں کیا تھا۔ چمپارن کے علاوہ بہار کی دنیا سے بھی جانکار نہیں تھے۔ مگر اس کے باوجود ان کی اور میری ملاقات کسی پرانے دوست کی ملاقات کی مانند تھی۔ اس لیے مجھے یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں بلکہ یہ حرف بہ حرف درست ہے کہ میں نے وہاں ایشور اور ستیہ کو عیاں صورت میں دیکھا۔ جب میں اس معاملہ پر غور کرتا ہوں تو مجھے اس میں محبت کے علاوہ اور کوئی بات نظر نہیں آتی اور یہ محبت اور اہنسا کے متعلق میری بے پناہ عقیدت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

چمپارن کا وہ دن میری زندگی میں ایسا تھا جس کو بالکل بھول نہیں سکتا۔ یہ میرے اور کسانوں کے لیے جشن کا دن تھا۔ مجھ پر سرکاری قانون کی رو سے مقدمہ چلایا جانے والا تھا۔ مگر سچ پوچھئے تو مقدمہ سرکار پر چل رہا تھا۔ کمشنر نے میرے لیے جو جال پھیلایا تھا۔ اس میں اس نے حکومت کو ہی پھنسا دیا تھا۔

مقدمہ چلا۔ سرکاری وکیل اور مجسٹریٹ وغیرہ متفکر تھے۔ انہیں سمجھ نہیں آتی تھی کہ

کیا کیا جائے۔ سرکاری وکیل تاریخ کے التوا کی کوشش کر رہا تھا۔ میں بیچ میں مخل ہوا اور عرض کی کہ تاریخ کے التوا کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ میں اپنا یہ جرم قبول کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے چمپارن کو چھوڑنے کے لیے نوٹس کی خلاف ورزی کی ہے۔ یہ کہہ کر میں نے اپنا جو چھوٹا سا بیان تیار کیا تھا وہ پڑھ کر سنایا۔ وہ اس طرح تھا۔

”عدالت کی اجازت سے مختصراً میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ نوٹس کے ذریعہ مجھے جو حکم ملا ہے اس کی میں نے خلاف ورزی کیوں کی؟ میرے خیال میں یہ مقامی اہلکاروں اور میرے درمیان اختلاف رائے کا سوال ہے۔ میں اس علاقہ میں قوم اور بنی نوع انسان کی خدمت کے خیال سے آیا ہوں۔ یہاں آ کر رعایا کی مدد کے لیے مجھے کافی مجبور کیا گیا تھا۔ جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ نیلہے صاحب اچھا سلوک نہیں کرتے لیکن جب تک میں تمام امور کو اچھی طرح جان نہ لیتا۔ ان لوگوں کی بالکل مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے ہو سکتا تو اہلکاروں اور نیلہے صاحبوں کی مدد سے میں سب باتیں جان لیتا۔ میں اور کسی مقصد کو مدِنظر رکھ کر یہاں نہیں آیا۔ مجھے یہ یقین نہیں آتا کہ میرے یہاں آنے سے کسی طرح امن میں خلل یا کسی کا جانی نقصان ہو سکتا ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے ان امور کا کافی تجربہ ہے۔ اہلکاروں کی مشکلات کو میں سمجھتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ انہیں جو خبر ملتی ہے۔ وہ صرف اسی کے مطابق کام کر سکتے ہیں۔ قانون کے سامنے سر جھکانے والے آدمی کی طرح میری بھی یہی عادت ہونی چاہیے تھی۔ اور اس بات پر عمل بھی کیا گیا کہ میں اس حکم کی تعمیل کروں۔ لیکن میں ان لوگوں کے متعلق جن کی وجہ سے یہاں آیا ہوں۔ اپنے فرض سے روگردان نہیں ہو سکتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں میں رہ کر ہی میں ان کی بھلائی کر سکتا تھا۔ دو فرائض کے تضاد کی وجہ سے میں صرف یہی کر سکتا تھا کہ اپنے آپ کو ہٹانے کی تمام تر ذمہ داری حاکموں پر چھوڑ دوں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہندوستان کی پبلک لائف میں میرے جیسے لوگوں کے سامنے معیار پیش کرنے میں سخت محتاط رہنا پڑتا ہے۔ میرا پختہ یقین ہے کہ میں جس حالت میں ہوں اس پر میں ہر ایک باعزت آدمی کے لیے وہی کام کرنا سب سے بہتر ہے جو اس وقت میں نے کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ اور وہ یہ کہ بلا کسی اختلاف کے عدول حکمی کی سزا پانے کے لیے تیار ہو جاؤں۔ میں نے جو بیان دیا ہے وہ اس لیے نہیں کہ مجھے جو

سزا ملنے والی ہے وہ کم کی جائے بلکہ اس بات کو دکھانے کے لیے کہ میں نے سرکاری حکم کی اس لیے خلاف ورزی نہیں کی ہے کہ مجھے حکومت پر اعتماد نہیں بلکہ اس لیے کہ میں نے اس حکم کو اپنی قوت تمیز کے بل پر..... عمل کرنا مناسب خیال کیا ہے۔''

اب مقدمہ کے التوا کی تو کوئی وجہ ہی نہیں رہی تھی۔ مجسٹریٹ اور سرکاری وکیل اتنی امید نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے سزا کے لیے عدالت نے فیصلہ ملتوی رکھا۔ میں نے تار کے ذریعہ وائسرائے کو تمام حالات سے روشناس کیا اور پٹنہ بھی تار بھیجا۔ اور بھارت بھوشن پنڈت مالویہ جی کو بھی تار سے خبر دی۔ اب سزا کے حکم کے سننے سے پہلے ہی مجھے مجسٹریٹ کا حکم ملا کہ لارڈ صاحب کے حکم سے مقدمہ واپس لے لیا گیا ہے اور کلکٹر کی چٹھی ملی کہ آپ جو جانچ کرنا چاہیں شوق سے کریں۔ اس سلسلہ میں سرکاری آدمیوں سے جو مدد لینا چاہیں لیں۔ اس فوری اور بہتر نتیجہ کی امید ہم میں سے کسی کو بھی نہیں تھی۔

☆☆☆

باب نمبر ۵۷

طریق کار

چمپارن کی انکوائری کا ذکر کرنا جس طرح چمپارن کے کسانوں کی تاریخ بیان کرنا ہے۔ یہ تاریخ اس جگہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ چمپارن کی انکوائری کیا تھی۔ اہنسا اور سچائی کا سب سے بڑا تجربہ تھا۔

پبلک کاموں کے لیے لوگوں سے روپیہ مانگنے کا ابھی تک رواج نہیں تھا۔ برج کشور بابو کا یہ گروہ وکلا کا ہی تھا۔ اس لیے جب کبھی ضرورت پڑتی تھی۔ تو یا تو وہ اپنی جیب سے روپیہ دیتے یا چند دوستوں سے مانگ لیتے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ جو لوگ مرفعہ الحال ہیں وہ عام لوگوں سے روپیہ کیسے مانگ سکتے ہیں اور میرا یہ پختہ یقین ہے کہ چمپارن کے لوگوں سے ایک کوڑی تک نہ لی جائے۔ ہم اگر ایسا کرتے تو اس کا الٹا اثر ہوتا اور یہ بھی فیصلہ شدہ تھا کہ اس انکوائری کے لیے ہندوستان کے عام لوگوں سے چندہ نہیں لینا چاہیے۔ اس طرح کام کرنے سے اس انکوائری کا سیاسیات اور قومی مفاد سے تعلق بن جاتا ہے۔ بمبئی کے دوستوں نے پندرہ ہزار کی امداد کا تار دیا۔ میں نے غربا کے ساتھ ہمنوا بن کر پوری طاقت سے اس تحریک کو چلانا تھا۔ اس لیے زیادہ روپے کی تو ضرورت بھی نہیں تھی۔ اور درحقیقت ضرورت پڑی بھی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ سب ملا کر دو تین ہزار سے زیادہ خرچ نہیں ہوا ہوگا اور مجھے یاد ہے کہ جتنا روپیہ اکٹھا کیا تھا۔ اس میں سے بھی پانچ سو یا ہزار روپیہ بچ گیا تھا۔

ابتدا میں ہماری وہاں رہائش عجیب قسم کی تھی اور میرے لیے تو وہ روزانہ کے تخول کا موضوع بن گئی تھی۔ ان وکلا کے پاس ایک ایک رسوئیا رہتا تھا۔ اور ہر ایک کی الگ الگ

رسوئی تیار ہوتی تھی۔ رات کے بارہ بجے تک وہ لوگ کھانا کھاتے تھے۔ اگر چہ یہ لوگ اپنا اپنا خرچ کرتے تھے۔ مگر اس کے باوجود میرے لیے اس قسم کی زندگی آفت سے کم نہیں تھی۔ ان رفیقوں کے ساتھ میرا اتنا گہرا تعلق ہو گیا تھا اور ہمارے بیچ میں کبھی غلط فہمی پیدا ہی نہیں ہوا کرتی تھی۔ میرے لفاظی تیرہ بڑی محبت سے برداشت کیا کرتے تھے۔ آخر کار یہ طے ہوا کہ نوکروں کو چھٹی دے دی جائے۔ اور سب مل کر کھانا کھائیں۔ اگر چہ سب لوگ ویجیٹیرین نہیں تھے۔ اس لیے مختلف قسم کی رسوئی تیار کرنے پر کافی خرچ آتا تھا۔ اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ویجیٹیرین کھانا تیار کیا جائے اور رسوئی مشترکہ بنے۔ خوراک کی سادگی پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ بہت کم خرچ آتا تھا۔ اس لیے ہمارے کام کا سلسلہ بڑھا اور وقت بچ گیا۔

ہمیں کافی مدد کی ضرورت تھی۔ کسانوں کے جھنڈ کے جھنڈ اپنی تکلیفات بیان کرنے آتے۔ پانچ سات محرر کام کرتے رہتے تھے۔ مگر اس کے باوجود سب کے بیان مکمل نہیں ہوا کرتے تھے۔ محرروں کو چند باتوں کا پابند رہنا پڑتا تھا۔ وہ یہ تھیں کہ ہر ایک کسان سے جرح کرنی چاہیے جو شخص جرح میں فیل ہو جائے اس کا بیان نہ لیا جائے۔ اور جس کا بیان ابتدا میں ہی کمزور ہو وہ تحریر نہ کیا جائے۔ اس تجویز پر عمل کرنے سے اگر چہ قدرے زاید وقت خرچ ہوتا تھا مگر پھر بھی سچے اور قابلِ ثبوت بیان لکھے جاتے تھے۔

جس وقت یہ بیان لکھے جاتے تھے تو خفیہ پولیس کے اہلکار وہاں ضرور رہا کرتے تھے۔ ہم انہیں روک سکتے تھے لیکن ہم نے ابتدا میں ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ انہیں روکا نہ جائے۔ یہی نہیں بلکہ ان کو آزاد رکھا جائے اور جو خبریں انہیں دی جاسکتی ہیں۔ وہ دے دی جائیں ہم جو بیان لیتے تھے۔ وہ انہیں دیکھتے اور سنتے تھے۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ لوگ کافی بے خوف ہو گئے اور ان کے سامنے بیان لینے کی وجہ سے حجت بازی وغیرہ کا خوف تک نہ رہا۔ یہ خوف کہ جھوٹ بولنے پر پولیس گرفت میں لے لے گی۔ انہیں سوچ سمجھ کر بولنا پڑتا تھا۔

میں نلہے کے مالکوں کو چڑانا نہیں چاہتا تھا۔ بلکہ اپنی رفاقت سے انہیں جیتنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس لیے جن امور کی نسبت زیادہ شکایتیں ہوا کرتی تھیں۔ میں انہیں چٹھی لکھتا اور خود ملنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ میں ان کی جماعت سے بھی ملا اور رعایا کی شکایات ان کے سامنے رکھیں اور ان کی باتیں بھی سنی تھیں۔ ان میں سے کئی تو میرے ساتھ نفرت سے

پیش آتے تھے۔ اور کئی اداس تھے۔ اور کئی لوگ ایسے بھی تھے جو دوستی کا اظہار کیا کرتے تھے۔

ایک طرف تو پبلک خدمت کے کام چل رہے تھے۔ اور دوسری طرف لوگوں کی مصیبت کی کہانیاں لکھتے رہنے کا کام دن بدن بڑھتا جاتا تھا۔ جب ہزاروں لوگوں کی کہانیاں لکھی گئیں تو بھلا اس کا اثر ہوئے بغیر کیسے رہتا۔ میری جگہ پر جوں جوں لوگوں کی آمد و رفت بڑھتی گئی۔ نلہے صاحبوں کی خشونت بھی وافر تر ہونے لگی۔ میری انکوائری کو بند کرانے کی کوششیں دن بدن بڑھنے لگیں۔ ایک دن مجھے حکومت بہار کا خط ملا۔ جس کا یہ مطلب تھا کہ میری انکوائری میں کافی دن لگ گئے ہیں۔ اب آپ کو اپنا کام ختم کر کے بہار سے چلے جانا چاہیے۔ خط سے اگر چہ رفاقت کی بو آتی تھی مگر اس کا مطلب عیاں تھا۔ میں نے لکھا پڑتال میں تو ابھی اور دن خرچ آئیں گے اور انکوائری کے بعد جب تک لوگوں کا دکھ دور نہیں ہو گا میرا بہار سے جانے کا ارادہ نہیں ہے۔

میری انکوائری بند کرانے کا حکومت کے پاس ایک ہی اچھا علاج تھا۔ لوگوں کی شکایات کو سچ مان کر انہیں دور کرنا اور ان کی شکایتوں پر توجہ دے کر اپنی طرف سے ایک انکوائری کمیٹی مقرر کر دینا۔ گورنر بہار سر ایڈورڈ گیٹ نے مجھے بلایا اور کہا کہ میں انکوائری بنانے کے لیے تیار ہوں۔ اور اس کا ممبر بننے کے لیے مجھے دعوت دی۔ دوسرے ممبروں کے نام دیکھ کر اور اپنے دوستوں سے مشورہ کر کے میں نے اس شرط پر ممبر بننا منظور کیا کہ مجھے اپنے دوستوں کی اجازت ہونی چاہیے اور سرکار کو سمجھ لینا چاہیے کہ ممبر بن جانے پر میرا کسانوں کی حمایت کا حق زائل نہیں ہو جاتا اور انکوائری کے بعد اگر میری تسلی نہ ہوئی تو کسانوں کی رہنمائی کی آزادی تلف نہیں ہو جائے گی۔

سر ایڈورڈ گیٹ نے ان شرائط کو مناسب خیال کر کے منظور کیا۔ مرحوم سر فرینک سلائی اس کے صدر بنائے گئے۔ انکوائری کمیٹی نے کسانوں کی تمام شکایات کو سچا بتایا اور یہ سفارش کی کہ نلہے لوگ غیر مناسب طریقہ سے حاصل کردہ رقومات کا کچھ حصہ واپس کر دیں اور تین کٹھیا کا ارادہ منسوخ کر دیا جائے۔

اس رپورٹ کے تیار کرنے میں سر ایڈورڈ گیٹ کا بڑا ہاتھ تھا۔ وہ اس بات پر مستحکم نہ رہتے اور پوری احتیاط سے کام نہ لیا ہوتا تو جو رپورٹ متفقہ طور پر لکھی گئی تھی۔ وہ

احاطہ تحریر میں نہ آتی۔ اور آخر کار جو قانون تیار ہوا تھا۔ وہ بن نہ سکتا۔ نلھوں کی طاقت بڑی کافی تھی۔ رپورٹ پاس ہونے کے بعد کئی لوگوں نے سخت مخالفت کی لیکن سر ایڈورگیٹ آخری وقت تک مستعد رہے اور کمیٹی کی تمام سفارشات پر انہوں نے پورا پورا عمل کر دیا۔

اس طرح سے سو سال کا یہ پرانا تین کاٹھیا قانون منسوخ ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی نلھوں کی حکومت بھی ختم ہو گئی جو رعایا دلی ہوتی تھی اس نے اپنی طاقت کو محسوس کیا اور یہ وہم دور ہو گیا کہ نیل کا داغ دھونے سے نہیں جاتا۔

☆☆☆

باب نمبر ۵۸

مزدوروں سے تعلق

چمپارن کی انکوائری کمیٹی سے فرصت ملی ہی تھی کہ احمد آباد سے شریمتی انسویا بہن کی چٹھی ان کی "مزدوروں کی کمیٹی" کے متعلق ملی۔ مزدوروں کی تنخواہ کم تھی۔ کافی عرصہ سے ان کا مطالبہ تھا کہ ہماری تنخواہیں بڑھائی جائیں میرے جی میں اس معاملہ پر ان کی مدد کا خیال تھا۔ اگرچہ وہ کام معمولی تھا لیکن میں اسے دور بیٹھ کر نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے میں فوراً احمد آباد پہنچا۔

اس معاملہ میں میری حالت بڑی نازک تھی۔ دوسروں کا خیال مجھے زیادہ پختہ معلوم ہوتا تھا۔ شریمتی انسویا بہن کو اپنے سگے بھائی کے ساتھ لڑنے کا موقعہ آ گیا تھا۔ مزدوروں اور مالکوں کی اس خوفناک تکرار میں شری امبالعل ساگر بھائی نے اہم پارٹ ادا کیا تھا۔ مل مالکوں کے ساتھ میرا گہرا رشتہ تھا۔ ان کے ساتھ تکرار میرے لیے مشکل کام تھا۔ میں نے انہیں آپس میں بات چیت کر لینے کی تاکید کی کہ کسی کو پنچ بنا کر مزدوروں کے مطالبات کا فیصلہ کر لیجیے لیکن مالکوں نے مزدوروں اور اپنے درمیان پنچ کی ہستی کو پسند نہ کیا۔

یہ دیکھ کر میں نے مزدوروں کو ہڑتال کرنے کا مشورہ دیا۔ اس مشورہ کے دینے سے قبل میں نے مزدوروں اور ان کے لیڈروں سے کافی واقفیت اور بات چیت کر لی تھی۔ میں نے انہیں ہڑتال کے لیے مندرجہ ذیل باتیں سمجھائیں:

۱۔ کسی حالت میں بھی امن میں خلل نہ آئے۔

۲۔ جو لوگ کام پر جانا چاہیں ان کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی اور جبر نہیں کرنا چاہیے۔

۳۔ مزدور مانگ کر روٹی نہ کھائیں۔

۴۔ خواہ جتنی دیر بھی ہڑتال کرنی پڑے انہیں ثابت قدم رہنا چاہیے اور جب روپیہ نہ رہے تو دوسری محنت کر کے پیٹ پال لیں۔

لیڈر لوگ ان شرائط کو تاڑ گئے اور انہیں پسند آ گئیں۔ اب مزدوروں نے ایک پبلک جلسہ کیا اور اس میں تجویز پاس کی کہ جب تک ہمارے مطالبات منظور نہیں کر لئے جاتے اور ان پر غور کرنے کے لیے پنچ مقرر نہ ہو جائیں اس وقت تک ہم کام پر نہیں جائیں گے۔

اس ہڑتال میں میری جانکاری شری دلبھ بائی اور شری شنکر لال بینکر سے اچھی طرح ہوگئی۔ شریمتی انسویا بہن سے تو میری پہلے ہی کافی جانکاری ہو چکی تھی۔

ہڑتالیوں کے جلسے روزانہ صبح کے وقت سابرمتی کے کنارے ایک پیڑ کے نیچے ہونے لگے۔ سینکڑوں کی تعداد میں لوگ اکٹھے ہوتے تھے۔ میں روزانہ انہیں اپنی پرتگیا یاد کرایا کرتا تھا اور امن قائم رکھنے کے علاوہ اپنی عزت کی حفاظت کی ضرورت کا احساس دلایا کرتا تھا۔ وہ لوگ اپنا ایک ٹیک کا جھنڈا لے کر روزانہ شہر میں جلوس نکالتے اور جلسے میں آتے تھے۔ یہ ہڑتال اکیس دن تک رہی۔ اسی دوران میں وقتاً فوقتاً مالکوں سے بات چیت ہوتی اور انہیں انصاف پر عمل کرنے کے لیے سمجھایا جاتا تھا۔ ہمیں بھی تو اپنا آسرا رکھنا ہے۔ ہمارا اور مزدوروں کا باپ بیٹے کا تعلق ہے۔ اگر اس بیچ میں کوئی پڑنا چاہے تو اس کو ہم کس طرح برداشت کر سکتے ہیں؟ باپ بیٹے میں پنچ کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے یہ جواب ملا کرتا۔

مزدوروں نے پہلے دو ہفتے کافی ہمت دکھائی اور خوب امن قائم رکھا اور روزانہ جلسوں میں کافی تعداد میں آیا کرتے تھے۔ میں انہیں روزانہ اپنے اقرار پر عمل کرنے کے لیے کہا کرتا تھا۔ وہ روزانہ پکار پکار کر کہتے تھے ہم مر جائیں گے مگر اپنا اقرار نہیں چھوڑیں گے۔

مگر آخر کار وہ نرم پڑنے لگے۔ جس طرح کمزور آدمی کو طیش آ جایا کرتا ہے اسی طرح کمزور ہوتے ہی وہ مل میں جانے والے مزدوروں سے جھگڑا کرنے لگے اور مجھے ڈر معلوم ہوا کہ شاید کہیں ان پر ظلم نہ کرنے لگ جائیں۔ روزانہ اجلاس میں حاضری کم ہونی شروع ہوئی اور جو آتے تھے۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑتی نظر آتی تھیں۔ مجھے خبر ملی کہ مزدور متزلزل ہونے لگے ہیں۔ میں تردد میں پڑ گیا۔ سوچنے لگا کہ ایسے وقت میں میرا کیا

فرض ہو سکتا ہے۔ مجھے جنوبی افریقہ کے مزدوروں کی ہڑتال کا تجربہ تھا۔ یہاں نیا تجربہ نہیں تھا۔ جس قسم کے لیے میں نے تحریک کی تھی اور جس کا میں روزانہ گواہ ہوا کرتا تھا وہ ارادہ کیسے متزلزل ہوا؟ اس خیال کو کمزور کہا جائے گا یا مزدوری اور سچائی کے متعلق محبت خیال کیا جائے گا۔

صبح کا وقت تھا۔ میں جلسہ میں تھا۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ مگر اجلاس میں ہی میری زبان سے نکل گیا۔ اگر مزدور دوبارہ تیار نہیں ہوں گے اور تو پھر کوئی فیصلہ نہیں ہوگا۔ ہڑتال جاری رہے۔ میں اس وقت برت رکھوں گا۔ وہاں جتنے مزدور تھے۔ حیران رہ گئے۔ انسویا بائی کی آنکھوں سے آنسو اتر آئے۔ مزدور بول اٹھے۔ آپ نہیں ہم برت رکھیں گے۔ آپ کو برت نہیں رکھنے دیں گے۔ ہمیں معاف کیجئے۔ ہم اپنے اقرار پر قائم رہیں گے۔

میں نے کہا۔ تمہارے برت رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنی پرتگیا پر عمل کرو۔ بس یہی کافی ہے۔ ہمارے پاس دھن نہیں ہے۔ ہمیں مزدوروں کو بھیک کی روٹی کھلا کر ہڑتال نہیں کرانی چاہیے۔ تم کہیں کوئی مزدوری کر کے پیٹ بھرنے کے قابل کام لو۔ تو پھر بے شک ہڑتال خواہ کتنی بھی لمبی ہو جائے تم بے فکر رہ سکتے ہو اور میرا برت تو کوئی نہ کوئی فیصلہ ہونے سے پہلے ٹوٹنے والا نہیں ہے۔

دلبھ بھائی مزدوروں کے لیے میونسپلٹی میں کام تلاش کرتے تھے۔ مگر وہاں کوئی کام نہیں تھا۔ آشرم بنائی گھر میں ریت بھرنی تھی۔ مگن لعل نے خبر دی کہ اس سلسلہ میں کافی مزدوروں سے کام لیا جا سکتا ہے۔ مزدور کام کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ انسویا بہن نے پہلی ٹوکری اٹھائی اور دریا سے ریت کی ٹوکریاں اٹھا کر لانے والے مزدوروں کا ٹھٹھ لگ گیا۔ یہ نظارہ قابلِ دید تھا۔ مزدوروں میں نیا جوش پیدا ہوا اور انہیں رقم دینے والے دیتے دیتے تھک جاتے تھے۔

اس برت میں ایک نقص تھا۔ میں یہ تحریر کر چکا ہوں کہ مل کے مالکوں کے ساتھ میرا گہرا تعلق تھا۔ اس لیے برت انہیں چوکنا کیے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ بطور ستیہ آگری کے میں ان کے خلاف برت نہیں رکھ سکتا۔ ان پر جو اثر ہو وہ مزدوروں کی ہڑتال کا ہی ہونا چاہیے۔ میرا پرائشچت ان کے نقص کی وجہ سے نہیں تھا۔ بلکہ مزدوروں کے نقص کی

وجہ سے تھا۔ میں مزدوروں کا نمائندہ تھا۔ اس لیے ان کی خامیوں سے نادم ہوتا تھا اور مل
مالکوں سے تو میں صرف استدعا ہی کر سکتا تھا۔ ان کے خلاف فاقہ کرنا تو ظلم تسلیم کیا جاتا۔
تاہم میں جانتا تھا کہ میرے فاقہ کا اثر ان پر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا۔ اس لیے رہا بھی نہیں
لیکن میں اپنے آپ کو روک نہیں سکتا تھا۔ میں نے اپنے فاقہ میں ایسے دلیل کن فرض کا
احساس پایا۔

میں نے مالکوں کو سمجھایا کہ میرے برت سے آپ کو اپنا طرزِ طریق بدلنے کی
ضرورت نہیں۔ انہوں نے مجھے تلخ ترش طعنے بھی دیئے۔ انہیں اس بات کا حق تھا۔ میں
صرف نرمی کی وجہ سے ہی سمجھوتے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ انسویا بہن کے ہاں ان کے جلسے
ہونے لگے۔ شری آنند شنکر دھرو بھی بیچ میں پڑے۔ آخر کار وہ جج چنے گئے اور ہڑتال ختم
ہوگئی۔ مجھے صرف تین دن ہی برت رکھنا پڑا۔ مالکوں نے مزدوروں میں مٹھائی تقسیم کی۔
اکیسویں دن سمجھوتا ہوگیا اور سمجھوتے کا جلسہ ہوا۔ اس میں ملوں کے مالک اور کمشنر حاضر
تھے۔ کمشنر نے مزدوروں کو مشورہ دیا کہ تمہیں ہمیشہ مسٹر گاندھی کے مشورہ پر عمل کرنا چاہیے۔
ان کمشنر صاحب سے اس واقع کے چند دن بعد فوراً ہی مجھے ایک لڑائی لڑنی پڑی۔ وقت بدل
گیا۔ اس لیے وہ بھی بدل گئے اور کھیڑا کے پارٹی داروں کو میرے مشورہ پر عمل نہ کرنے کے
لیے کہنے لگے۔

☆☆☆

باب نمبر ۵۹

رولٹ ایکٹ اور میری مشکلات

یہاں ضلع کھیڑا کے کسانوں کے ستیہ آگرہ کی بات چھیڑ دی جاتی ہے جس حکومت
نے حسب خواہش اور ملا تحریک کسانوں کے مطالبات منظور کر لیے تھے۔ اسی حکومت کی مدد
کا ابھی کیسے موقع آ گیا۔ یورپ میں جنگِ عظیم جاری تھی۔ دہلی میں ہونے والی جنگی کمیٹی
میں مجھے بلایا گیا۔ میرے سامنے فرض کی مشکلات تھیں۔ انگلینڈ کی دوسری حکومتوں سے
پوشیدہ معاہدہ کے متعلق ذکر جاری تھا۔ میں نے اپنا اعتراض پیش کیا۔ وائسرائے چیمسفورڈ
صاحب نے مجھے بحث کے لیے بلایا اور میں نے کمیٹی میں آنا منظور کر لیا تھا اور خط کے ذریعہ
اپنے خیالات کا بھی اظہار کر ڈالا تھا۔ لوکمانیہ تلک اور علی بھائی وغیرہ لیڈروں کی غیر حاضری
کا میں نے اعتراض کیا اور لوگوں کے سیاسی مطالبات اور جنگ سے پیدا ہونے والے
مسلمانوں کے مطالبات کا ذکر کیا۔

اس کے بعد رنگروٹوں کی بھرتی کا کام تھا۔ کھیڑا کے کسانوں کو یہ بات کچھ پسند
نہیں تھی۔ مگر اس کے باوجود ہمیں کافی آدمی ملنے لگ گئے۔ میرے اس کام پر سخت نکتہ چینی
ہوئی۔ لیکن میں نے اس بات کو پوری توجہ سے سننا اپنا فرض خیال کیا۔ جس حکومت کے زیرِ
سایہ ہم مستقبل میں حصہ دار بننے کی امید کرتے ہیں۔ اس کی مصیبت کے وقت مدد کرنا ہمارا
فرض تھا۔ میرے لیے یہ وفاداری کا بھی سوال تھا۔ میں تو انگریزوں جیسی وفاداری ہر ایک
ہندوستانی سے کرنا چاہتا تھا۔

لیکن میری طویل بیماری اور چند دنوں میں ختم ہونے والی جنگ نے میری تمنا کو

ادھورا رہنے دیا۔ میں صحت کی بحالی کے لیے ماتھیران گیا۔

دوستوں سے یہ مشورہ پا کر کہ ماتھیران جانے سے جلد صحت ہو جائے گی۔ اسی لیے میں ماتھیران گیا تھا لیکن وہاں کا پانی کافی بھاری تھا اس لیے میرے جیسے بیمار کے لیے وہاں رہنا دوبھر ہو گیا۔ پیچش کی وجہ سے سخت تکلیف تھی اور زخم پڑ جانے کی وجہ سے سخت درد ہوتا تھا۔ اس لیے کوئی چیز کھانے سے بھی ڈر ہی لگتا تھا۔ ایک ہفتہ میں ہی ماتھیران سے واپس ہوا۔ میری صحت کی نگہداشت کا کام شری شنکر لعل جی نے سنبھالا۔ انہوں نے مجھے ڈاکٹروں سے مشورہ کرنے کی سخت تاکید کی۔ ڈاکٹر دلال کو بلایا گیا۔ ان کی فوری فیصلہ کی قوت نے مجھے حیرت زدہ کر ڈالا۔ انہوں نے کہا۔

جب تک آپ دودھ کا استعمال نہیں کریں گے۔ صحت اچھی نہیں ہو گی۔ صحت کو برقرار رکھنے کے لیے آپ کو ضرور دودھ استعمال کرنا چاہیے اور فولاد یا سنکھیے کا انجکشن کرانا چاہیے۔ اگر اس بات کے لیے آمادہ ہو جائیں تو آپ کے جسمانی حالت کے درست کرنے کی گارنٹی دیتا ہوں۔

میں نے جواب دیا آپ انجکشن کریں لیکن میں دودھ کا استعمال نہیں کروں گا۔

ڈاکٹر نے پوچھا۔ آپ کی دودھ نہ پینے کی کیسی پرتگیا ہے؟

میں نے کہا۔ گائے بھینس کو پھونکا لگا کر دودھ نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس بات کے پتہ چلنے پر مجھے دودھ سے نفرت ہو گئی ہے اور میں یہ تو ہمیشہ سے تسلیم کرتا ہوں کہ دودھ انسانی خوراک نہیں ہے۔ اس لیے میں نے دودھ پینا چھوڑ دیا ہے۔

کستورا بائی جو میری چارپائی کے پاس ہی کھڑی تھی۔ وہ فوراً بول اٹھی۔ پھر تو بکری کا دودھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر دلال نے بیچ میں ہی روک کر کہا۔ اگر بکری کا دودھ استعمال کرو تو میرا کام چل جائے گا۔

میں نرم پڑ گیا۔ ستیہ آگرہ کی لڑائی نے میرے جذبات میں زندگی سے محبت افروز ہونے کا احساس نمودار کر ڈالا اور میں نے پرتگیا کے الفاظ سے صبر افروز ہو کر روح پر جبر کیا۔ دودھ گھی کی قسم لیتے وقت اگرچہ میرے سامنے گائے بھینس کا ہی خیال تھا۔ مگر اس کے

باوجود میری پرتگیا صرف دودھ کے لیے ہی تسلیم کرنی چاہیے اور جب تک میں حیوانات کے دودھ کو انسانی خوراک کے لیے ممنوع تسلیم کرتا ہوں اس وقت تک مجھے کھانے میں اس کے استعمال کا حق نہیں ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی میں بکری کا دودھ لینے کے لیے تیار ہو گیا چنانچہ سچائی کے پوجاری نے ستیہ آگرہ کی لڑائی کے لیے زندہ رہنے کی خواہش رکھ کر اپنی سچائی پر داغ لگا دیا۔

میرے اس کام کی وجہ سے وہ زخم اب تک مندمل نہیں ہوا اور بکری کا دودھ چھوڑنے کے لیے ہمیشہ غور کرتا رہا ہوں۔ بکری کا دودھ استعمال کرتے وقت میں روزانہ تکلیف محسوس کرتا لیکن سیوا کرنے کی لطیف تر محبت جو میرے ذہن پر غالب تھی۔ مجھے چھوڑتی ہی نہیں تھی۔ اہنسا کے خیال سے مجھے اپنے خوراک کے تجربات بڑے محبت افروز معلوم ہوا کرتے تھے۔ مجھے ان سے خوشی محسوس ہوتی تھی اور اسی میں مجھے دلچسپی نظر آتی تھی لیکن بکری کا دودھ مجھے کسی طرح سے برا محسوس نہ ہوا۔ بلکہ یہ مجھے حقانیت کے نکتہ نظر سے برا معلوم ہوا۔ میں خود اہنسا کو جس حد تک پہچان پایا ہوں بہ نسبت اس کے میں سچائی کو زیادہ پہچانتا ہوں۔ میرا یہی خیال ہے اور اگر میں سچائی کو چھوڑ دوں تو اہنسا کی بڑی الجھن کو میں بالکل سلجھا نہیں سکوں گا۔ میرا یہی تجربہ ہے۔

راستی پر عمل تو برتوں کے ذریعہ جسم اور روح کی حفاظت سے ہے مگر میں نے یہاں روح کو حقیقت کی الجھن میں ڈال دیا ہے جو مجھے ہمیشہ کے لیے برا محسوس ہوتا رہے گا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ برتوں کی نسبت میرا کیا فرض ہے۔ میں یہ جان نہیں پایا اور نہ مجھے ان پر عمل کی ہمت ہوتی ہے کیونکہ دونوں میں ایک ہی بات موجود ہے۔ شبہ کی غلطی سے عقیدت کم ہو جاتی ہے۔ ایشور مجھے عقیدت افروز کرے۔

بکری کا دودھ استعمال کرنے کے چند دن بعد ڈاکٹر دلال نے دبر کے راستہ پر نشتر لگا دیا۔ جس میں انہیں کافی کامیابی حاصل ہوئی۔

اسی حالت میں جبکہ میں بکری کے دودھ سے اٹھنے کی امید باندھ ہی رہا تھا اور اخبار پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ اتنے میں رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میرے ہاتھ آ گئی۔ اس میں جو سفارشات پائی جاتی تھیں انہیں دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ بھائی عمر اور شنکر لعل نے کہا کہ اس

کام کے لیے کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ ایک آدھ ماہ میں احمد آباد پہنچا۔ شری دلبھ بھائی میرے حالات دریافت کرنے کے لیے قریباً روزانہ آیا کرتے تھے۔ میں نے اس سلسلہ میں ان سے بات چیت کی اور یہ مطلع بھی کیا کہ ضرور کچھ کرنا چاہیے۔ انہوں نے دریافت کیا۔ کیا کیا جا سکتا ہے؟ میں نے جواب دیا۔ اگر کمیٹی کی سفارشات کے مطابق قانون بنایا جائے تو اس کام کے لیے قسم لینے والے چند ایک آدمیوں کے مل جانے کی صورت میں ہمیں ستیہ آگرہ کر دینا چاہیے۔ اگر میں بیمار نہ ہوتا تو میں اکیلا ہی نبرد آزمائی کرتا اور یہ امید رکھتا کہ بعد کو اور لوگ بھی آ کر شامل ہو جائیں گے۔ میری لاچارگی کی وجہ سے مجھے اکیلا لڑنے کی ہمت ہی نہیں ہے۔

اس بات چیت کے نتیجہ کے طور پر چند لوگوں کا اجلاس بلانے کا فیصلہ ہوا۔ جو میرے میل جول میں اچھی طرح آتے تھے۔ رولٹ کمیٹی کی شہادتوں سے مجھے تو یہ اچھی طرح پتہ چل گیا تھا کہ اس نے جو سفارشیں کی ہیں۔ اس قسم کے قانون کی ضرورت نہیں ہے اور میرے خیال میں یہ بات اتنی ہی واضح تھی کہ اس قسم کے قوانین کوئی بھی غیرت مند قوم برداشت نہیں کر سکتی۔

جلسہ بلایا گیا۔ اس میں صرف بیس آدمیوں کو مدعو کیا گیا تھا جہاں تک مجھے یاد ہے۔ اس میں دلبھ بھائی کے علاوہ شریمتی سروجنی نیڈو، مسٹر ناریمان، مرحوم عمر سبحانی، شری شنکر لال بینکر اور شریمتی انسویا بہن وغیرہ تھے۔

ایک حلف نامہ تیار کیا گیا۔ مجھے یہ یاد ہے کہ جس قدر لوگ وہاں موجود تھے سب نے اس پر دستخط کیے۔ اس وقت میں کوئی اخبار نہیں نکالتا تھا لیکن وقتاً فوقتاً اخباروں میں لکھا کرتا تھا۔ اس وقت بھی میں نے مضمون لکھا اور شنکر لعل بینکر نے خوب ہلچل پیدا کر ڈالی۔ ان کی کام کرنے اور تنظیم کی قوت کا اس وقت مجھے اچھی طرح تجربہ ہوا۔

مجھے یہ ناممکن معلوم ہوا کہ اس وقت کوئی بھی موجودہ جماعت ستیہ آگرہ جیسے ہتھیار کو اٹھا سکے۔ اس لیے ستیہ آگرہ سبھا قائم کی گئی۔ اس میں زیادہ تر بمبئی سے نام ملے اور اس کا مرکز بھی بمبئی میں رکھا گیا۔ حلف ناموں پر دستخط ہونے لگے اور جس طرح کھیڑا کی لڑائی میں ہوا تھا۔ اس میں بھی بلیٹن نکالے اور مختلف مقامات پر جلسے کیے۔

میں اس سبھا کا صدر بنا تھا۔ میں نے دیکھا کہ تعلیم یافتہ طبقہ اور میرے درمیان زیادہ میل ملاپ نہیں ہو سکے گا اور سبھا میں گجراتی زبان پر ہی میرا اصرار اور میرے طریقہ کار کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ مگر مجھے یہ ماننا چاہیے کہ کئی لوگوں نے میرے کام کو سنبھالنے کی فراخدلی دکھائی لیکن میں نے ابتدا میں ہی دیکھ لیا کہ یہ سبھا زیادہ عرصہ نہیں چل سکتی اور میں جو سچائی اور اہنسا پر زیادہ زور دیا کرتا تھا وہ بھی کچھ لوگوں کو اچھا معلوم نہ ہوا۔ تاہم شروع میں تو یہ کام بڑے زور سے چل نکلا۔

☆☆☆

باب نمبر ۶۰

ایک عجیب نظارہ

ایک طرف رولٹ کمیٹی کے خلاف تحریک بڑھتی گئی تو دوسری طرف سرکار ان کی شفارشات کو عمل میں لانے کے لیے کمر بستہ ہونے لگ گئی۔ رولٹ بل شائع ہو گیا۔ میں اسمبلی کے اجلاس میں ایک بار ہی گیا ہوں۔ اس وقت رولٹ کمیٹی کا معاملہ پیش تھا۔ شاستری جی کی تقریر ہو رہی تھی۔ اس وقت وائسرائے شاستری جی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے تو یہ معلوم ہوا کہ شاستری جی کی تقریر کا اثر ان پر بھی ہوا۔ شاستری جی سے جوش امڈا پڑتا تھا۔

لیکن سوئے کو بیدار کیا جا سکتا ہے اور اگر جاگتا ہوا سونے کا ڈھونگ بنائے تو اس کے کانوں میں ڈھول بجانے پر بھی کچھ بن نہیں پڑتا۔ اسمبلی میں بلوں پر مخول کرنے کی کوشش کرنی ہی چاہیے۔ کیونکہ حکومت نے خود یہ مخول بنایا ہوا ہے۔ مگر انہوں نے جو کام کرنا تھا۔ اس کا فیصلہ تو ہو ہی چکا تھا۔ اس لیے شاستری جی کی چتاونی بیکار ثابت ہوئی۔

میری طوطی کی آواز کو کون سنتا تھا۔ میں نے وائسرائے سے مل کر اچھی طرح استدعا کی۔ ذاتی خط لکھے۔ کھلی چٹھیاں لکھیں اور ان میں یہ تحریر کیا کہ ستیہ آگرہ کے علاوہ میرے پاس اور کوئی تدبیر نہیں ہے مگر سب بیکار گیا۔

ابھی بل گزٹ میں شائع نہیں ہوا تھا اور میری صحت کمزور تھی۔ مگر میں نے طویل سفر کی زحمت اٹھائی۔ مجھے بلند آہنگی سے بولنے کی ہمت نہیں تھی اور کھڑا ہو کر بولنے کی جو طاقت ختم ہوئی تو وہ پھر واپس نہ آئی۔ کھڑے ہو کر بولنے سے تھوڑے عرصہ میں ہی سارا جسم لرزنے لگ جاتا تھا اور چھاتی میں درد پیدا ہوتا تھا مگر مجھے ایسا معلوم ہوا کہ مدراس سے آئی

ہوئی دعوت ضرور قبول کرنی چاہیے۔ جنوبی علاقہ اس وقت تک مجھے گھر کی مانند معلوم ہوتا تھا۔ جنوبی افریقہ کے تعلقات کی وجہ سے میں یہ مانتا آیا ہوں کہ تامل' تیلگو وغیرہ جنوبی صوبوں کے لوگوں پر میرا کچھ حق ضرور ہے۔ اب تک یہ معلوم نہیں کہ میں نے اس پہلو میں کوئی غلطی کی ہو دعوت سورگیہ شری کستوری رنگا آئینگر کی طرف سے تھی۔ مدراس پہنچتے ہی مجھے معلوم ہوا کہ اس دعوت کو دینے والے راجگو پال آچاریہ جی ہیں۔ شری راجگو پال آچاریہ جی سے میری یہ پہلی جانکاری کہی جا سکتی ہے اس دفعہ صرف اتنی واقفیت ہوئی کہ میں انہیں دیکھتے ہی پہچان سکوں۔

پبلک کاموں میں زیادہ حصہ لینے کے ارادہ سے اور شری کستوری رنگا آئینگر وغیرہ دوستوں کی ایما سے وہ سلیم چھوڑ کر مدارس میں وکالت کرنے والے تھے۔ میرا ان کے پاس ہی ٹھہرانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ ایک دو دن بعد مجھے معلوم ہوا کہ میں ان کے ہی گھر اترا ہوں۔ وہ بنگلا شری کستوری رنگا آئینگر جی کا ہونے کی وجہ سے میں نے یہ مان لیا تھا کہ میں ان کا ہی مہمان ہوں۔ لیکن مہادیو ڈیسائی نے میری غلطی کو دور کیا۔ راجگو پال آچاریہ بھی دور ہی رہتے تھے مگر مہادیو نے ان سے کافی جانکاری کر لی تھی۔ مہادیو نے مجھے کہا کہ آپ کو شری راجگو پال آچاریہ جی سے واقفیت کر لینی چاہیے۔

جب میں نے جانکاری حاصل کی۔ اس کے بعد روزانہ لڑائی کے مختلف پہلوؤں پر بات چیت کیا کرتا تھا۔ جلسوں کے علاوہ مجھے اور کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ رولٹ بل اگر قانون بن جائے تو اس کی ہمیں خلاف ورزی کیسے کرنی چاہیے۔ اس کے علاوہ اس کی خلاف ورزی ہو سکتی ہے؟ اس کی میعاد ہی کہاں مقرر ہے؟ ایسی ہی باتیں ہوا کرتی تھیں۔

شری کستوری رنگا آئینگر نے لیڈروں کا ایک معمولی اجلاس بلایا۔ اس میں خوب بحث ہوئی۔ اس میں شری وجے راگھو آچاریہ خوب حصہ لیتے تھے۔ انہوں نے مطلع کیا کہ معمولی سے معمولی خبریں لکھ کر مجھے ستیہ آگرہ کے ہتھیار کو روشناس کرنا چاہیے۔ مگر میں نے کہا کہ یہ کام میری ہمت سے بعید ہے۔

اسی طرح مشورے ہو رہے تھے کہ اتنے میں خبر آئی کہ بل قانونی صورت میں گزٹ میں شائع ہو رہا ہے۔ جس دن یہ خبر ملی اس رات میں سوچتا سوچتا سو گیا۔ دوسرے

دن صبح کے وقت میں کافی سویرے اٹھا۔ نیم بیداری کی حالت میں خواب میں ہی خیال آیا اور دن چڑھتے ہی میں نے راجگوپال آچاریہ کو بلایا اور کہا۔

مجھے رات کو خواب میں خیال آیا ہے کہ قانون کے جواب میں ہم نے سارے ملک کو ہڑتال کے لیے آمادہ کیا ہے۔ ستیہ آگرہ کہ تم شدھتا کی لڑائی ہے یہ دھارمک لڑائی ہے۔ دھرم کا کام شدھ ہردے سے ہونے چاہئیں۔ سب لوگ ایک دن فاقہ کریں اور کام بند رکھیں۔ مسلمان بھائی روزہ کے علاوہ اور کوئی برت نہیں رکھتے۔ اس لیے انہیں چوبیس گھنٹے کا روزہ کا مشورہ دینا چاہیے۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اس میں تمام صوبے شامل ہوں گے یا نہیں بمبئی مدارس بہار اور سندھ کی تو مجھے امید ہے۔ اتنے مقامات پر اگر ٹھیک ہڑتال ہوگئی تو تسلی رکھنی چاہیے۔

یہ بات شری راجگوپال آچاریہ جی کو پسند آئی اور بعد کو فوراً دوسرے دوستوں سے کہا۔ سب نے برضا و رغبت اس بات کو قبول کر لیا۔ میں نے ایک چھوٹا سا نوٹس تیار کر کے شائع کیا ہے۔ ۱۹۱۹ء کے تیس مارچ کی تاریخ رکھی گئی تھی لیکن بعد کو ۶/اپریل کی گئی لوگوں کو بہت تھوڑے دنوں کا نوٹس ملا۔ مگر فوری کام کی ضرورت تھی۔ طویل مدت کا وقت نہیں تھا۔

لیکن کون جانے کس طرح ساری تنظیم ہوگئی۔ سارے ہندوستان کے شہروں اور گاؤں میں ہڑتال ہوئی۔ نظارہ قابلِ دید تھا۔

☆☆☆

باب نمبر ۶۱

وہ ہفتہ

جنوبی ہندوستان میں دورہ کر کے عموماً میں ۴/اپریل کو بمبئی پہنچا۔ شری شنکر لال بینکر کا تار تھا کہ ۶/اپریل کا پروگرام پورا کرنے کے لیے مجھے بمبئی حاضر رہنا چاہیے۔

لیکن اس سے قبل ۳۰ تاریخ کو دہلی میں ہڑتال منائی جا چکی تھی۔ اس دن دہلی میں سورگیہ سوامی شردھانند جی اور مرحوم حکیم اجمل خان صاحب کی حکومت تھی۔ ہڑتال ۶/اپریل کے لیے ملتوی کر دینے کی خبر دہلی میں دیر سے پہنچی۔ اس دن جیسی دہلی میں ہڑتال ہوئی ویسی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ہندو اور مسلمان ایک دل معلوم ہوئے شردھانند جی کو جامعہ مسجد میں مدعو کیا گیا اور وہاں انہیں تقریر کرنے دی گئی تھی۔ ان باتوں کو سرکاری افسر برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جلوس سٹیشن کی طرف چلا جا رہا تھا کہ اسے پولیس نے روک لیا۔ پولیس نے گولی چلائی۔ کئی آدمی زخمی ہوئے اور کئی آدمیوں کا خون ہوا۔ دہلی میں جبری پالیسی پر عمل کیا گیا۔ شردھانند جی نے مجھے دہلی بلایا۔ میں نے تار دیا کہ بمبئی میں چھ تاریخ گزار کر میں فوراً دہلی چلا آؤں گا۔

جس طرح دہلی میں ہوا۔ ویسے ہی لاہور، امرتسر میں بھی ہوا تھا۔ امرتسر سے ڈاکٹر ستیہ پال اور کچلو کے تار مجھے فی الفور بلا رہے تھے۔ اس وقت میں ان دونوں بھائیوں کو بالکل نہیں پہچانتا تھا۔ دہلی سے ہو کر امرتسر جانے کا فیصلہ کر کے میں نے انہیں بلایا تھا۔

۶/اپریل کو بمبئی میں ہزاروں آدمی چوپاٹی میں نہانے گئے اور وہاں سے ٹھاکر دوار جانے کے لیے جلوس نکالا۔ اس میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ جلوس میں مسلمان بھی کافی تعداد میں شامل ہوئے تھے۔ اس جلوس سے ہمیں مسلمان بھائی ایک مسجد میں لے

گئے۔ وہاں شریمتی سروجنی دیوی سے اور مجھ سے تقریریں کرائی گئیں۔ یہاں شری وٹھل داس جے راجی نے سودیشی اور ہندو مسلم اتحاد کی قسم اٹھانے کے لیے کہا۔ مگر میں نے اتنی جلدی میں قسم لینے سے انکار کر دیا اور جو کچھ ہو رہا تھا۔ اس سے ہی اطمینان حاصل کرنے کی تحریک کا حلف اٹھانے اور قسم لینے کے بعد وہ ٹوٹ نہیں سکتی۔ اس لیے ہمیں سودیشی کے معنی سمجھانے چاہیں اور ہندو مسلم اتحاد کی ذمہ داری پر بھی خیالات کا اظہار کیا اور مطلع کیا کہ جو لوگ قسم اٹھانا چاہتے ہیں وہ بے شک کل صبح چوپاٹی کے میدان میں تشریف لائیں۔

بمبئی کی ہڑتال کامیاب رہی۔

یہاں آئین کی خلاف ورزی کی تیاری کر لی گئی تھی۔ قانون کی خلاف ورزی کے قابل دو تین چیزیں تھیں اور یہ قانون ایسے تھے جو قابلِ تنسیخ تھے۔ اس لیے ان کی آسانی سے خلاف ورزی ہو سکتی تھی۔ مگر ان میں سے ایک پر ہی تجربہ کا فیصلہ ہوا تھا۔ نمک پر لگایا ہوا ٹیکس زیادہ اکھرتا تھا۔ اس ٹیکس کے ہٹانے کے لیے کافی لوگ کوشش کر رہے تھے۔ اس لیے میں نے ایک خبر مشتہر کی تھی کہ ہر ایک شخص بلا اجازت گھر میں نمک بنائے۔ دوسرا قانون گورنمنٹ کی ضبط کردہ کتابوں کے فروخت کرنے کے متعلق تھا۔ ایسی دو کتابیں خود میری ہی تھیں، وہ تھیں "ہند سوراجیہ" اور یہ ان کتابوں کو شائع کرنا اور فروخت کرنا سب سے آسان قانون کی خلاف ورزی معلوم ہوئی۔ اس لیے انہیں شائع کرایا اور شام کا برت چھوڑ کر چوپاٹی کے جلسہ کے اختتام کے بعد انہیں بیچنے کا انتظام کیا۔

شام کو کافی والنٹیر ان کتابوں کو فروخت کرنے نکل پڑے۔ میں خود ایک موٹر میں نکلا اور ایک میں شریمتی سروجنی نکلیں۔ کتاب کی سب کاپیاں بک گئیں۔ اس طرح جو رقم وصول ہوئی۔ وہ عدم تعاون کی جنگ میں ہی شامل کرنے والی تھی۔ قیمت فی کاپی چار آنہ لیکن میرے ہاتھ میں یا سروجنی دیوی کے ہاتھ میں شاید ہی کسی نے چار آنے رکھے ہوں۔ اپنی جیب سے جو کچھ نکل آئے سب کچھ ادا کر کے لینے والے بہت کافی آدمی نکل پڑے۔ کئی دس روپے اور کئی پانچ روپے کا نوٹ دیا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک کاپی کے لیے پچاس روپے کا نوٹ بھی ملا تھا۔ لوگوں کو سمجھایا گیا تھا کہ لینے والوں کو بھی سزا کا خوف ہے لیکن تھوڑی دیر کے لیے لوگوں نے جیل کا خوف دلوں سے دور کر دیا۔

۷/اپریل کو معلوم ہوا کہ جن کتابوں کے فروخت کرنے کی سرکار نے منادی کی تھی۔ سرکار کے خیال سے وہ فروخت شدہ تسلیم نہیں کی جاسکتیں۔ جو فروخت ہوتی ہیں وہ دوسرا ایڈیشن سمجھا جائے گا۔ ضبط شدہ کتابیں نہیں۔ اس لیے یہ نیا ایڈیشن چھاپنے اور خریدنے میں کوئی ہرج نہیں۔ لوگوں نے جب یہ خبر سنی تو سخت مایوس ہوئے۔

اس دن سویرے چوپاٹی پر لوگوں کو سودیشی کا حلف اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے اکٹھا ہونا تھا۔ وٹھل داس جیراجی کو پہلی بار معلوم ہوا کہ اجلا رنگ ہونے پر ہر ایک شے دودھ نہیں ہو سکتی۔ بہت کم لوگ اکٹھے ہوئے تھے۔ میں نے حلف نامہ بنا رکھا تھا۔ ان کا مطلب حاضرین کو اچھی طرح سمجھا کر ان سے حلف لیا گیا۔ مگر حاضری کم ہونے کی صورت میں بھی مجھے افسوس نہ ہوا۔ بلکہ کئی لوگوں کے عجلت خیز کام اور سکون سے کیے جانے والے کاموں میں فرق اور پہلے کی مانند طرفداری اور بصورتِ دیگر عدم رغبتی کا احساس میں متواتر اس وقت کرتا آ رہا ہوں۔

۷/تاریخ کو میں دہلی اور امرتسر کے لیے چلا۔ ۱۸/اپریل کو متھرا پہنچا تو معلوم ہوا کہ شاید مجھے گرفتار کر لیں۔ متھرا کے بعد ایک سٹیشن پر گاڑی کھڑی تھی۔ وہاں مجھے آچاریہ گڈوانی ملے۔ انہوں نے پختہ خبر سنائی کہ آپ کو ضرور گرفتار کیا جائے گا اور اگر میری خدمت کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ضرورت پڑنے پر خدمت سے گریز نہیں کروں گا۔

پلول کے آنے سے پہلے ہی پولیس افسر نے میرے ہاتھوں میں حکم نامہ رکھ دیا کہ تمہارے پنجاب میں داخل ہونے سے خللِ امن کا اندیشہ ہے۔ اس لیے تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ پنجاب کی حدود میں داخل نہ ہو۔ پولیس نے حکم دے کر مجھے اتر جانے کے لیے کہا مگر میں نے اترنے سے انکار کر دیا اور کہا میں بے اطمینانی بڑھانے نہیں بلکہ دعوت ملنے پر بے چینی کو دور کرنے کے لیے جا رہا ہوں۔ اس لیے مجھے افسوس ہے کہ میں اس حکم کو تسلیم نہیں کر سکتا۔

مہادیو ڈیسائی میرے ہمراہ تھے۔ انہیں دہلی جا کر شردھانند جی کو خبر کرنے اور لوگوں کو پرامن رکھنے کے لیے کہا اور حکم کی خلاف ورزی سے جو سزا ہوا سے برداشت کرنے

کا میں نے فیصلہ کیا اور سزا ہونے پر بھی پر امن رہنے میں ہی ہماری فتح ہے۔ یہ سمجھانے کے لیے بھی کہا۔

پلول سٹیشن پر مجھے اتار کر پولیس کے سپرد کر دیا گیا اور دہلی سے آنے والی کسی ٹرین کے تیسرے درجہ کے ڈبہ میں مجھے بٹھا دیا گیا۔ ساتھ پولیس کی جمعیت تھی۔ متھرا پہنچنے پر مجھے پولیس بیرک میں لے گئے۔ کوئی افسر یہ بتا نہیں سکتا تھا کہ میری نسبت کیا کیا جائے گا اور مجھے کہاں لے جانا ہے۔ صبح کے چار بجے مجھے بیدار کیا گیا اور ایک مال گاڑی میں لے گئے اور دوپہر کو سوائی مادھو پور میں اتار دیا گیا۔ وہاں بمبئی کی میل ٹرین سے لاہور کے انسپکٹر بیرنگ آئے۔ انہوں نے مجھے اپنی تحویل میں لیا اور بمبئی لے جا کر چھوڑ دیا۔

میرے گھر پہنچتے ہی عمر سبحانی اور انسویا بہن موٹر میں آئیں اور مجھے پائیدھونی چلنے کے لیے کہا۔ لوگ انتظار میں ہیں اور جوش بڑھ رہا ہے اور ہمارے کوشش کرنے پر بھی وہ خاموش نہیں ہوتے۔ آپ کے دیکھنے پر ہی خاموش ہوں گے۔

میں موٹر میں سوار ہو گیا۔ پائیدھونی پہنچتے ہی راستہ میں کافی ہجوم دیکھا۔ مجھے دیکھ کر لوگوں میں خوشی کی لہر موجزن ہو اٹھی اور جلوس بن گیا۔ ''اللہ اکبر اور بندے ماترم'' کے نعروں سے آسمان گونجنے لگا۔

پائیدھونی پر گھڑ سواروں کو دیکھا۔ اوپر سے اینٹوں کی بارش ہوتی تھی۔ میں لوگوں کو پر امن رہنے کے لیے ہاتھ جوڑ کر استدعا کر رہا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم اینٹوں کی اس بارش سے بچ نہیں سکیں گے۔

عبدالرحمٰن سٹریٹ میں کرافرڈ مارکیٹ کی طرف جاتے ہوئے جلوس روکنے کے لیے گھڑ سوار آ پہنچے اور جلوس کو فورٹ کی طرف جانے سے روکنے کے لیے وہ سخت کوشش کر رہے تھے۔ لوگ کسی طرح قابو میں نہیں آتے تھے۔ لوگوں نے پولیس کی لائن کو چیر کر آگے بڑھنا شروع کیا۔ ایسا نہیں تھا کہ میری آواز سب کو سنائی دیتی اور طرہ یہ کہ گھڑ سواروں نے افسروں نے لوگوں کو منتشر ہونے کا حکم دے دیا اور گھڑ سواروں کے بھالے تان کر ہجوم پر اقدام شروع کر دیا۔ مجھے ڈر لگ گیا۔ مگر اس خوف کی کوئی بنیاد نہیں تھی۔ ساتھ ہی ساتھ لوگ بڑی سرعت سے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ ہجوم منتشر ہو گیا۔ بھگدڑ مچ گئی۔ کئی دب گئے اور

کئی زخمی ہو گئے۔ گھڑ سواروں کے نکلنے کے لیے کوئی راستہ نہ رہا۔ لوگوں کے آس پاس ہٹنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ اگر وہ پیچھے ہٹیں تو بھی ہزاروں کی بھیڑ تھی۔ بڑا خوفناک منظر تھا۔ گھڑ سوار اور ہجوم دونوں جوش میں تھے۔ گھڑ سوار نہ کچھ دیکھتے اور نہ دیکھ سکتے تھے۔ وہ تو آنکھیں موند کر گھوڑوں کو سرپٹ دوڑا رہے تھے۔ جتنی دیر اس ہزاروں کے ہجوم کو چیرنے میں لگی اتنی دیر میں دیکھا کہ وہ کچھ دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔

ہجوم تو اس طرح منتشر ہو گیا۔ اس وقت ہماری موٹر کو آگے بڑھنے دیا۔ میں نے کمشنر کے دفتر کے سامنے موٹر رکوائی اور ان سے پولیس کے سلوک کے متعلق فریاد کرنے کے لیے اترا۔

☆☆☆

باب نمبر ۶۲

ہفتہ کی یاد

جب میں کمشنر گرفس کے دفتر میں پہنچا تو ان کی سیڑھی کے قریب جاتے ہی دیکھا کہ ہتھیار بند سپاہی تیار بیٹھے تھے۔ جس طرح کسی جنگ کے لیے تیاری کر رہے ہوں۔ برآمدہ میں بھی شور مچ رہا تھا۔ میں خبر بھیج کر دفتر میں داخل ہوا تو کمشنر کے پاس مسٹر ہیرنگ کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔

میں نے جو کچھ دیکھا تھا۔ اس کا کمشنر سے ذکر کیا۔ اس نے مختصراً جواب دیا۔ جلوس کو ہم فورٹ کی طرف جانے نہیں دیتے تھے۔ اگر جلوس وہاں پہنچتا تو شور وشر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ میں نے دیکھا کہ لوگ زبانی منع کرنے پر رکنے والے نہیں تھے۔ اس لیے حملہ کرنے کے علاوہ اور کوئی تدبیر نہیں تھی۔

میں نے جواب دیا۔ مگر اس کے نتیجہ کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔ لوگ گھوڑوں کے نیچے ضرور کچلے گئے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گھڑ سواروں کے بھیجنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

صاحب نے جواب دیا۔ آپ کو بالکل پتہ نہیں چل سکتا۔ آپ سے کہیں زیادہ ہم پولیس والوں کو خبر رہتی ہے کہ لوگوں پر آپ کی ترغیب کا کیسا اثر ہے۔ اگر ہم پہلے سے ہی سخت قدم نہ اٹھاتے تو زیادہ نقصان کا احتمال تھا۔ میں تو آپ سے یہ کہتا ہوں کہ لوگ آپ کے اقتدار میں آنے والے نہیں ہیں۔ وہ قانون کی خلاف ورزی کو فوراً سمجھ جائیں گے۔ اس طرح اگرچہ امن برقرار رکھنا مشکل ہوا کرتا ہے اور آپ کی دلیل بہتر ہے مگر آپ کی بات تو سب لوگ سمجھ نہیں سکتے۔ وہ تو اپنی فطرت کے مطابق ہی عمل کریں گے۔

میں نے کہا۔ یہاں ہی تو آپ میں اور میرے درمیان اختلاف رائے ہے۔ لوگ طبعی طور پر ہی لڑاکے نہیں ہیں بلکہ امن پرور ہیں۔"

اب ہم دلائل کی طرف راغب ہوئے۔

آخر کار صاحب بولے۔ خیر اگر آپ کو یہ یقین ہو جائے کہ لوگوں نے آپ کو نہیں سمجھا تو آپ کیا کریں گے؟

اگر مجھے یہ یقین ہو جائے تو یہ لڑائی ملتوی رکھوں گا۔

ملتوی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ نے تو مسٹر ہیرنگ سے کہا ہے کہ میں رہا ہوتے ہی فوراً پنجاب چلے جانا چاہتا ہوں۔

ہاں میرا خیال تو دوسری ٹرین سے واپس جانے کا تھا لیکن یہ آج تو بالکل نہیں ہوسکتا۔

ذرا صبر کریں۔ آپ کو کافی باتوں کا پتہ چل جائے گا۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ احمد آباد میں کیا ہو رہا ہے؟ امرتسر میں کیا ہوا ہے؟ لوگ تو ہر جگہ پاگل ہوئے ہیں۔ مجھے بھی پورا علم نہیں ہے۔ کئی جگہ تاریں ٹوٹ گئی ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ ان تمام دنگوں کی ذمہ داری آپ پر ہے۔

میں نے جواب دیا۔ جہاں میری ذمہ داری ہوگی۔ میں انکار نہیں کروں گا۔ اگر لوگ احمد آباد میں کچھ کریں تو مجھے حیرت اور دکھ ہوگا۔ امرتسر کی نسبت میں کچھ نہیں جانتا۔ وہاں کبھی گیا ہی نہیں ہوں اور نہ مجھے کوئی جانتا ہے۔ مگر میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ حکومت پنجاب نے مجھے وہاں جانے کی ممانعت نہ کی ہوتی تو میں وہاں امن کو برقرار رکھنے میں کافی حصہ لے سکتا تھا۔ مجھے روک کر حکومت نے لوگوں کو پر جوش کر دیا ہے۔

اسی طرح ہماری گفتگو کا سلسلہ جاری رہا مگر ہماری رائے میں اتحاد کا امکان تک نہیں تھا۔

چوپاٹی پر جلسہ کر کے لوگوں کو پر امن کرنے کا ارادہ ظاہر کر کے میں نے چھٹی حاصل کی۔

چوپاٹی پر جلسہ ہوا۔ میں نے لوگوں کو امن اور ستیہ آگرہ کی نسبت سمجھایا اور کہا۔

ستیہ آگرہ بچوں کا کھیل نہیں ہے اور اگر لوگ پرامن نہیں رہیں گے تو میری ستیہ آگرہ کی جنگ کامیاب نہیں ہوگی۔

احمد آباد سے شریمتی انسویا بائی کو بھی خبر مل چکی تھی کہ وہاں ہلڑ مچا ہے۔ کسی نے افواہ اڑا دی تھی کہ وہ بھی گرفتار ہوگئی ہے۔ یہ سن کر مزدور پاگل ہوئے تھے۔ انہوں نے ہڑتال کی اور شوروشر برپا کیا اور ایک سپاہی کا خون بھی ہوا۔

میں احمد آباد پہنچا۔ نڑیاد کے قریب ریل کے اکھاڑنے کی بھی کوشش ہوئی تھی۔ دیرم گاؤں میں خون ہوا تھا۔ جب میں احمد آباد پہنچا اس وقت وہاں مارشل لا جاری تھا۔ لوگ خوفزدہ ہو رہے تھے۔ لوگوں نے جیسا کیا ویسا بمعہ سود پا لیا۔

مجھے مسٹر پریٹ کمشنر کے پاس لے جانے کے لیے سٹیشن پر آدمی کھڑا تھا۔ میں ان کے ہاں پہنچا۔ وہ سخت غصہ میں تھے۔ میں نے انہیں اطمینان سے جواب دیا اور مفاد کے لیے اظہار افسوس کیا اور مارشل لا کی ضرورت کے خلاف بھی کہا اور جن تدابیر پر عمل کرنے سے دوبارہ امن برقرار رہ سکتا ہے۔ ان پر عمل کرنے کا طریقہ بتایا۔ اس کے بعد جلسہ کرنے کی اجازت طلب کی اور اس جلسہ کو اپنی آشرم کی زمین پر بلانے کی نسبت رائے پیش کی۔ انہیں یہ بات پسند آئی۔ مجھے یاد ہے کہ اس تجویز کے مطابق ۱۳/ مئی اتوار کے دن جلسہ ہوا تھا۔ اور مارشل لا بھی اسی دن یا اس کے دوسرے دن ہٹا لیا گیا تھا۔ اس جلسہ میں میں نے لوگوں کو ان کے نقائص بتانے کی کوشش کی۔ میں نے پرائشچت کے طور پر تین دن فاقہ بھی کیا اور لوگوں کو ایک دن کے فاقہ کی صلاح دی اور جو لوگ خون ریزی میں شامل ہوئے تھے۔ انہیں اپنا جرم تسلیم کرنے کا مشورہ دیا۔

میں نے اپنا فرض اچھی طرح دیکھا۔ جن مزدوروں وغیرہ میں میں نے اتنا عرصہ گزارا تھا اور ان کی خدمت کی تھی لہٰذا جن کی بھلائی کی ہی امیدیں باندھتا تھا۔ ان کا ہلڑ بازی میں شامل ہونا مجھے سخت برا محسوس ہوا اور میں نے اپنے آپ کو ان کے جرائم میں حصہ دار تسلیم کیا اور ستیہ آگرہ کو فی الفور ملتوی کرنے کا ارادہ کر لیا۔

☆☆☆

باب نمبر ۶۳

ہمالیہ کی مانند غلطی

احمد آباد کے جلسہ کے بعد میں نڑیاد میں گیا۔ ہمالیہ کی مانند غلطی کے نام کے استعمال کا شہرہ ہوا۔ اس کا تجربہ میں نے ابتدا میں نڑیاد میں کیا تھا لیکن احمد آباد میں ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگ گیا تھا۔ مگر نڑیاد میں وہاں کی حالت پر غور کرنے سے کھیڑا ضلع کے کئی آدمیوں کی گرفتاری کا ذکر سنتے ہوئے جس جلسہ میں میں اس موضوع پر بول رہا تھا۔ وہاں ہی مجھے فی الفور خیال آیا کہ کھیڑا ضلع کے یا ایسے ہی دوسرے لوگوں کو قانون کی خلاف ورزی کرنے کے لیے مستعد کرنے میں میں نے عجلت سے کام لیا ہے اور وہ غلطی مجھے ہمالیہ کی مانند معلوم پڑی۔

جب میں نے یہ غلطی تسلیم کی۔ اس وقت میرا خوب مذاق اڑا تھا۔ تاہم مجھے یہ تسلیم کرنے میں ذرا بھی افسوس نہیں ہے اور میں نے ہمیشہ اس بات کو تسلیم کیا کہ جب ہم دوسروں کے پہاڑ کی مانند نقص کو معمولی محسوس کریں گے تو اور اپنے پہاڑ کی مانند نقص کو رائی کے برابر خیال کریں گے تو ہمیں حقیقت نفس الامر کا پتہ چلے گا اور میں نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ ستیہ آگرہی بننے کے خواہش مند کو اس اصول پر عمل کرنے کے لیے بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

جب آپ کو علم ہوگا کہ وہ ہمالیہ کی مانند نظر آنے والی غلطی تھی اور کیا قانون کی وہ لوگ ہی خلاف ورزی کر سکتے ہیں جن لوگوں نے قانون کو سر جھکا کر تسلیم کر لیا ہو۔ مگر عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ہم قانون کو اس کی خلاف ورزی میں پائی جانے والی سزا کے خوف سے

مانتے ہیں اس کے علاوہ یہ بات بالخصوص ان قوانین پر حاوی ہوتی ہے جن میں حکمت عملی وغیرہ کا خیال نہیں ہوتا۔ قوانین ہوں یا نہ ہوں اور اچھا خیال کیے جانے والے لوگ ایسے چوری نہیں کریں گے۔ مگر اس کے باوجود رات کو سائیکل کی بتی جلانے کے قاعدہ سے نکل جانے میں ایسے اچھے آدمی کو بھی رنج نہیں ہوگا اور ایسے قواعد پر اگر کوئی عمل کرنے کا مشورہ بھی دے تو بھلا مانس آدمی اس پر عمل کرنے کے لیے فی الفور تیار نہیں ہو سکے گا۔ مگر جب یہ بات قانون بن جاتی ہے اور اس کی خلاف ورزی پر جرمانے کا خوف ہوتا ہے تو جرمانہ کی ادائیگی سے بچنے کے لیے ہی وہ بتی جلائے گا۔ مگر یہ قواعد پر عمل تسلیم نہیں کیا جاتا۔

لیکن ستیہ آگرہی تو اجتماعی کے قوانین پر سمجھ بوجھ کو عمل کرے گا اور اس طرح جس قدر جماعتی قوانین پر عمل کیا جائے گا۔ اس میں ہی سماج کے طریق کار کے یہ عمل کی طاقت پیدا ہوا کرتی ہے اور اس کے حالات کے پیش نظر مختلف قواعد اور آئین کی خلاف ورزی کا حق حاصل ہوتا ہے۔ ایسا حق حاصل کرنے سے قبل ہی اس قسم کے اقدام کی غلطی مجھے ہمالیہ کی مانند معلوم ہوئی اور کھیڑا ضلع میں داخل ہوتے ہی مجھے وہاں کی لڑائی کی یاد آ گئی اور معلوم ہوا کہ میں نے سامنے دیوار کو دیکھے بغیر ہی آنکھ موند کر سرپٹ دوڑ لگائی ہے۔ میں نے یہ سوچا کہ پہلے لوگوں کو اس قابل بنایا جائے۔ انہیں اپنی حقیقت کا پتہ ہونا چاہیے اور جن لوگوں نے اپنی مرضی سے قانون کی خلاف ورزی کی ہے اور در پردہ کئی بار خلاف ورزی کی ہو وہ بھلا ستیہ آگرہ کے اصولوں کو کس طرح پہچان سکیں گے؟ اور اس پر کس طرح عمل پذیر ہوں گے۔

یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اس بات پر ہزاروں لاکھوں لوگ عمل نہیں کر سکتے۔ لیکن بات اگر ایسی ہی ہو کہ ستیہ آگرہ کے عمل سے پہلے لوگوں کو سمجھانے والے اور انہیں راستہ بتانے والے والنٹیروں کی جماعت تیار ہونی چاہیے تا کہ ایسی جماعت کو ستیہ آگرہ اور اس کی حقیقت کا پورا پورا علم ہونا چاہیے۔

میں ان خیالات کو لے کر بمبئی پہنچا اور ستیہ آگرہ سبھا کے ذریعہ میں نے ستیہ آگرہی والنٹیر بنائے اور ان کے ذریعہ لوگوں کو سول نافرمانی کی تعلیم دینی شروع کی اور ستیہ آگرہ کی حقانیت کو بتانے والے اخبار نکالے۔

یہ کام چلا تو سہی مگر میں نے دیکھا کہ اس میں لوگوں کی کافی دلچسپی پیدا نہیں

کر سکا۔ والنٹیر کافی تعداد میں نہ ملے۔ یہ کہا نہیں جا سکتا کہ جو لوگ بھرتی ہوئے ان سب نے ٹریننگ بھی لی تھی یا نہیں۔ بھرتی میں نام لکھانے والے بھی لوگ جس طرح دن گزرتے جاتے پختہ کار ہونے کی بجائے بھاگنے لگ گئے۔ میں سمجھ گیا کہ اس گاڑی کو جس رفتار سے چلانے کی میں امید کرتا ہوں وہ اس سے کہیں آہستہ چلے گی۔

☆☆☆

باب ۶۴

پنجاب میں

پنجاب میں جو کچھ ہوا اس کے لیے سر مائیکل اوڈائیر نے مجھے گناہگار ٹھہرایا تھا۔ ادھر وہاں کے کئی نوجوان فوجی قوانین کے لیے بھی مجھے قصوروار ٹھہرانے سے جھجکتے نہیں تھے۔ وہ جوش میں آ کر یہ دلیل دیتے تھے کہ اگر میں سول نافرمانی کو بند نہ کرتا تو جلیانوالا باغ میں کبھی قتل نہ ہوتے۔ اور نہ ملٹری قانون جاری کیا جاتا۔ چند لوگوں نے تو دھمکیاں بھی دی تھیں کہ اگر اب آپ نے پنجاب میں قدم رکھا تو آپ کو قتل کر دیا جائے گا۔

لیکن میں تو مان رہا تھا کہ جو کچھ میں نے کیا ہے۔ وہ اس قدر مناسب اور درست تھا کہ اس سے سمجھدار لوگوں کو غلط فہمی نہیں ہو سکتی تھی۔ میں پنجاب جانے کے لیے مجبور ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے میں نے پنجاب نہیں دیکھا تھا لیکن جو کچھ چشم دید دیکھنا چاہیے دیکھنے کی زبردست خواہش تھی اور مجھے بلانے والے ڈاکٹر ستیہ پال' ڈاکٹر کچلو اور رام بھجدت چودھری وغیرہ سے ملنے کی زبردست خواہش تھی۔ وہ تھے تو جیل میں لیکن مجھے کامل یقین تھا کہ انہیں حکومت زیادہ دیر تک جیل میں نہیں رکھ سکتی۔ جب کبھی میں بمبئی جاتا تو کئی پنجابی ملنے کے لیے آ جاتے تھے۔ ان میں جوش اور امنگ ہوتی۔ اس وقت مجھے خود اعتمادی پر بھروسہ تھا۔

میرا پنجاب جانا ملتوی ہی ہوتا جاتا تھا اور وائسرائے بھی یہ کہہ کر التوا ڈالتے جاتے تھے کہ ابھی وقت نہیں ہے۔

اتنے میں ہنٹر کمیٹی آئی۔ وہ فوجی قوانین کی انکوائری کے لیے مقرر ہوئی تھی۔ دین بندھو اینڈریوز وہاں پہنچ گئے۔ ان کی چٹھیوں میں وہاں کے دردناک حالات ہوا کرتے تھے

اور ان کے خطوط سے یہ آشکارا ہوتا تھا کہ اخبارات میں جو کچھ شائع ہو چکا ہے۔ فوجی قانون نے ان سے بھی زیادہ ظلم کیا تھا۔ وہ بھی پنجاب آنے کی تاکید کر رہے تھے۔ دوسری طرف مالویہ جی وغیرہ کے تار آ رہے تھے کہ آپ کو ضرور پنجاب پہنچ جانا چاہیے۔ میں نے پھر وائسرائے کو تار دیا۔ ان کا جواب آیا کہ آپ فلاں تاریخ کو جا سکتے ہیں۔ اب تاریخ ٹھیک ٹھیک یاد نہیں آتی۔ مگر شاید وہ ۱۷/اکتوبر تھی۔

لاہور پہنچ کر میں نے جو منظر دیکھا وہ ناقابلِ فراموش تھا۔ سٹیشن پر میرے استقبال کے لیے اتنا ہجوم اکٹھا ہوا تھا جس طرح کسی کافی دنوں کے جدا رفیق سے ملنے کے لیے اس کے سگے رشتہ دار آئے ہوں۔ لوگ خوشی سے پاگل ہو رہے تھے۔ پنڈت رام بھجدت چودھری کے ہاں میں ٹھہرایا گیا تھا۔ شریمتی سرلا دیوی چودھرانی سے میری پہلے ہی واقفیت تھی۔ میری مہمان نوازی کا بار ان پر آ پڑا۔ مہمان نوازی کے لفظ کا استعمال میں جان بوجھ کر کر رہا ہوں کیونکہ آج کل کی مانند اس وقت بھی میں جہاں ٹھہرتا وہ مکان ایک دھرم شالہ ہی بن جاتا تھا۔

میں نے پنجاب میں دیکھا کہ وہاں کے پنجابی لیڈروں کے جیل میں جانے کی وجہ سے پنڈت مالویہ جی پنڈت موتی لال جی اور سورگیہ سوامی شردھانند جی نے ان کی جگہ حاصل کر لی تھی۔ مالویہ جی اور شردھانند جی کے تقرب میں تو میں کافی رہ چکا تھا لیکن پنڈت موتی لال کے تقرب میں تو میں لاہور میں ہی آیا۔ ان کے علاوہ دوسرے مقامی لیڈروں نے جن کو جیل جانے کا فخر حاصل نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے بھی فوراً مجھے اپنا بنا لیا اور مجھے کہیں بھی یہ معلوم نہ ہوا کہ میں کوئی اجنبی ہوں۔

ہم سب نے متحد ہو کر ہنٹر کمیٹی کے سامنے شہادت نہ دینے کا فیصلہ کیا۔ اس کے وجوہات اسی وقت نمایاں کر دیے تھے۔ اس لیے یہاں ان کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ وہ باتیں بالکل سادہ تھیں اور آج بھی میرا یہ خیال ہے کہ ہم نے جو کمیٹی کا بائیکاٹ کیا وہ مناسب ہی تھا۔

لیکن اگر ہنٹر کمیٹی کا بائیکاٹ کیا جائے تو پھر عام لوگوں اور کانگرس کی طرف سے کوئی انکوائری کمیٹی مقرر کی جانی چاہیے۔ ہم لوگ اس نتیجہ پر پہنچے۔ پنڈت موتی لال نہرو سورگیہ چترنجن داس' شری عباس طیب جی' شری جیکر اور میں اتنے ممبر مقرر ہوئے۔ ہم

انکوائری کے لیے الگ الگ مقامات پر مقرر کئے گئے اور اس کمیٹی کے انتظام کا کام آسانی سے مجھ پر آ پڑا تھا۔ اور میرے حصہ میں زیادہ سے زیادہ گاؤں کی انکوائری آ جانے کی وجہ سے مجھے پنجاب کے دیہات کو دیکھنے کا اچھا موقعہ ملا۔

اس انکوائری کے دنوں میں پنجاب کی استریاں تو مجھے ایسے معلوم ہوئیں جس طرح میں انہیں عرصہ سے پہچانتا ہوں۔ میں جہاں جاتا وہاں ہجوم در ہجوم استریاں آ جاتیں اور اپنے کتے ہوئے سوت کے ڈھیر لگاتی جاتیں۔ اس انکوائری کے ساتھ ہی میں اچانک اس بات کو دیکھ پایا کہ پنجاب کھدر کا ایک وسیع مرکز بن سکتا ہے۔

جوں جوں میں لوگوں پر ہوئے مظالم کی تحقیقات زیادہ گہرائی سے کرنے لگا۔ میرے اندازہ سے بھی بڑھ کر حکومت کی نادر شاہی اور حاکموں کی من مانی دیکھ کر حیرت اور دکھ ہوتا۔ وہ پنجاب جہاں سے حکومت کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں فوجی بھرتی ملتی ہے وہاں کے لوگ اتنا بڑا ظلم کس طرح برداشت کر پائے۔ اس بات سے میں سخت حیران تھا اور آج بھی ہوتا ہوں۔

اس کمیٹی کی رپورٹ تیار کرنے کا کام میرے سپرد کیا گیا تھا۔ جو لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ پنجاب میں کس کس طرح کے ظلم بپا کئے گئے۔ انہیں یہ رپورٹ ضرور پڑھنی چاہیے۔ اس رپورٹ کی نسبت میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس میں جان بوجھ کر کہیں بھی جھت بازی سے کام نہیں لیا گیا جو کچھ لکھا ہے۔ اس کے ثبوت رپورٹ میں موجود ہیں اور رپورٹ میں جو ثبوت مہیا کئے گئے ہیں اس سے زیادہ ثبوت کمیٹی کے پاس تھے۔ ایسی ایک بھی بات رپورٹ میں درج نہیں تھی جس کی نسبت ذرا بھی شک ہو۔ اس طرح سچائی کو سامنے رکھ کر لکھی ہوئی رپورٹ کو قارئین دیکھ سکتے ہیں کہ برٹش حکومت اپنی ہستی قائم رکھنے کے لیے کس حد تک جا سکتی ہے اور کتنے عجیب وغریب کام کر سکتی ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس رپورٹ کی ایک بھی بات آج تک غلط ثابت نہیں ہوئی۔

☆☆☆

باب نمبر ۶۵

کانگرس میں

آخر کار مجھے کانگرس میں حصہ لینا پڑا۔ اسے میں کانگرس میں شمولیت نہیں مانتا۔ اس سے پہلے کانگرس کے جن اجلاسوں میں شامل ہوا۔ وہ تو صرف وفاداری کے طور پر تھا۔ ادنیٰ سے ادنیٰ سپاہی کے علاوہ وہاں میرا اور کوئی کام نہیں تھا۔ ایسا خیال میرا پچھلے دوسرے اجلاسوں میں بالکل نہیں ہوا تھا اور نہ ایسی خواہش پیدا ہوئی تھی۔

امرتسر کے تجربہ نے بتایا کہ میری ایک طاقت کا استعمال کانگرس کے لیے ہے۔ میرے پنجاب میں کام کی وجہ سے لوکمانیہ، مالویہ جی، موتی لعل جی اور دیش بندھو جی وغیرہ بڑے خوش ہوئے۔ میں نے یہ دیکھا تھا اسی لیے انہوں نے مجھے اپنی میٹنگوں اور مشوروں میں بلایا۔ میں نے اتنا تو دیکھا کہ سبجیکٹ کمیٹی کا اصلی کام ان میٹنگوں میں ہوا کرتا تھا۔ اور اس کام میں وہ لوگ شامل ہوا کرتے تھے۔ جن پر لیڈروں کو خاص اعتماد ہوا کرتا تھا۔ اور دوسرے لوگ بھی کسی نہ کسی بہانے سے آ جاتے تھے۔

اگلے سال کے ہونے والے دو کاموں میں میری دلچسپی تھی۔ کیونکہ ان میں میرا انتخاب ہو چکا تھا۔

ایک تھا جلیانوالے کی خونیں یادگار۔ اس سلسلہ میں کانگرس نے دھوم دھام سے تجویز پاس کی۔ کوئی پانچ لاکھ روپیہ اکٹھا کرنا تھا۔ اس رقم کے نگرانوں میں میں بھی تھا۔ ملکی کاموں کے لیے چندہ مانگنے کی جن لوگوں میں کافی ہمت ہے ان میں مالویہ جی کا نمبر پہلا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرا درجہ ان سے کافی کم ہے۔ مجھے اپنی اس کمزوری کا جنوبی افریقہ میں

پتہ چلا تھا۔ راجاؤں مہاراجاؤں پر جادو پھیر کر لاکھوں روپیہ حاصل کرنا میری ہمت کا کام نہیں تھا اور آج بھی نہیں ہے۔ اس معاملہ میں مالویہ جی کی مانند میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ لیکن جلیانوالا باغ کے معاملہ میں ان لوگوں سے روپیہ نہیں مل سکتا۔ میں یہ جانتا تھا۔ اس لیے اس یادگار کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کا بوجھ میرے سر آ رہا۔ میں یہ بات نگران بنتے ہی سمجھ گیا تھا۔ ہوا بھی یہی کچھ۔ اس یادگار کے لیے بمبئی کے شہریوں نے خاص رقم دی اور آج بھی اس کے لیے لوگوں سے جتنی رقم کی ضرورت ہو مل جاتی ہے۔ مگر اس ہندو، مسلمان اور سکھوں کے مشترکہ خون سے پاک زمین پر کس طرح کی یادگار بنائی جائے۔ یعنی آمدہ رقم کو کیسے استعمال کیا جائے۔ یہ سوال بڑا مشکل تھا کیونکہ تینوں فرقوں میں ان دنوں میں آج دشمنی کا احساس نظر آ رہا ہے۔

میری دوسری طاقت سیکرٹری کا کام کرنے کی تھی۔ جو کانگرس کے لیے کام دے سکتی تھی۔ کافی دنوں کے تجربہ سے کہاں، کیسے اور کتنے کم الفاظ میں نرمی سے بعید لہجہ میں لکھنا میں جان سکا ہوں۔ اس بات کو لیڈر لوگوں نے سمجھ لیا تھا۔ اس وقت کانگرس کی جس طرح تنظیم تھی وہ گوکھلے کے خیالات پر تھی۔ انہوں نے کئی قاعدے مختلف قسم کے بنائے تھے۔ ان کی تاریخ میں نے ان کی زبانی ہی سنی تھی لیکن اس وقت سب تسلیم کرنے کا ذکر بھی ہر سال چلتا تھا۔ مگر کانگرس کے پاس ایسا کوئی کام نہیں تھا۔ جس سے سارا سال کام چلتا رہے یا کسی کو مستقبل کا خیال ہو۔ کانگرس کے تین سیکرٹری ہوتے تھے۔ مگر دراصل ایک سیکرٹری ہوا کرتا تھا لیکن وہ بھی چوبیس گھنٹے دینے والا نہیں ہوتا تھا۔ سیکرٹری دفتر کا کام کرتا اور مستقبل کا خیال رکھتا تھا یا سابقہ ذمہ داریوں کو اس سال نبھانے کے لیے کام کیا کرتا تھا۔ اس لیے اس سال سب کے سامنے یہ اہم سوال تھا کہ سالانہ اجلاس میں تو ہزاروں کی حاضری ہو جاتی ہے۔ مگر اس سے عام پبلک کا کام نہیں چل سکتا۔ نمائندوں کی کوئی حد نہیں تھی۔ ہر ایک صوبہ سے جتنے بھی ہو سکیں نمائندے آ سکتے تھے اور ہر آدمی نمائندہ بن سکتا تھا۔ اس لیے اس معاملہ پر غور کی ضرورت محسوس ہوئی اور کانگرس کے نئے اصول مرتب کرنے کا بار میں نے اپنے سر لیا۔ مگر میری ایک شرط تھی۔ میں عوام پر دو لیڈروں کا غلبہ دیکھ رہا تھا۔ اس لیے میں نے ان کے نمائندوں کے مطالبات بھی حاصل کیے اور مجھے پتہ تھا کہ لیڈر لوگ آرام سے

بیٹھ کر اصول و قواعد مرتب نہیں کر سکتے۔ اس لیے لوکمانیہ اور دیش بندھو سے میں نے ان کے دو قابل اعتماد نام طلب کیے۔ اس کے علاوہ اور کوئی آئین بنانے والی کمیٹی میں نہیں ہونا چاہیے۔

میری یہ تجویز منظور ہو گئی۔ لوکمانیہ نے شری کیلکر اور دیش بندھو جی نے شری آئی بی سین کا نام دیا۔ مگر یہ کمیٹی ایک دن بھی مل کر نہ بیٹھ سکی۔ لیکن اس کے باوجود ہم نے اپنا کام چلایا۔ مجھے اس بات کا غرور نہیں ہے۔ میں مانتا ہوں کہ میری باتوں پر اگر عمل کیا جائے تو آج ہمارا بیڑا پار ہو سکتا ہے۔ یہ تو کسی وقت بھی ہو سکتا تھا۔ جواب دہی کے بعد ہی میں قدم اٹھانا ہی میرا اعتقاد ہے۔

ستیہ آگرہ کو ملتوی کرتے ہی میں نے امن بحال کرنے کا فیصلہ کیا اور ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑے کا تو میں ۱۹۰۸ء سے ہی حامی تھا۔ مگر ابھی تک مجھے چرخہ نہیں ملا تھا۔ ۱۹۱۵ء میں آشرم کے قیام کے بعد ہاتھ کے سوت کا خیال آیا۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ مل کے کتے ہوئے سوت کے کپڑوں کا استعمال ہمیں سوت کاتنے والی مل کا بلا تنخواہ کا ایجنٹ بنا رہا ہے۔ اس الجھن سے اس وقت آزادی مل سکتی ہے۔ جب ہم پرانے چرخے کو دوبارہ استعمال کریں۔ میں اس کام میں لگ گیا۔ سو رگیہ گنگا بہن مزموںدار نے جن سے میں بھڑوچ میں ملا تھا۔ چرخے کی تلاش میں پھرنے کی قسم لی۔ اچھی طرح جستجو کے بعد گنگا بہن کو گائیکواڑ کے بے جاپور گاؤں میں چرخہ مل گیا۔ اس کے بعد میں نے انہیں مطلع کیا اور دھنیے کی تلاش کی اور اسے ۲۵ روپے ماہوار کے لگ بھگ تنخواہ پر مقرر کیا۔ اس نے بچوں کو پونی بنانا سکھایا۔ میں نے روئی کی بھی بھیک مانگی۔ اب آشرم میں چرخے میں دیر نہ لگی۔ مگن لعل گاندھی نے اچھوت ایجاد سے چرخے میں سدھار کیا اور آشرم میں تکوے تیار کیے۔ آشرم کے کھدر کے پہلے تھان پر سترہ آنے گز خرچ آیا اور میں نے دوسروں سے موٹی کچے سوت کے کھادی کے ایک گز ٹکڑہ کے سترہ آنے وصول کیے۔ جو انہوں نے بخوشی ادا کیے۔

اب میں بالکل کھادی میں ملبوس ہونے کے لیے مستعد ہو گیا۔ میری دیسی مل کی ہوا کرتی تھی۔ بیجاپور اور آشرم میں جو کھدر بنتا تھا۔ وہ بہت موٹا اور تیس انچ عرض کا ہوا کرتا تھا۔ میں نے گنگا بہن سے کہا کہ اگر ۴۵ انچ عرض کے کھدر کی دھوتی ایک ماہ میں نہ دو گی تو

مجھے موٹے کھدر کے استعمال سے کام چلانا پڑے گا۔ گنگا بہن گھبرا اٹھی۔ یہ کام مشکل معلوم ہوا۔ مگر ہمت نہ ہاری۔ انہوں نے ایک ماہ میں ہی مجھے ۵۰ انچ عرض کی دھوتی کا جوڑا لا دیا اور میری ور درتا دور ہوئی۔

اسی دوران میں بھائی لکشمی داس لاٹھی گاؤں سے ایک اچھوت بھائی رام جی اور ان کی استری گنگا بہن کو آشرم میں لائے۔ جن کے ذریعہ طویل عرض کی دھوتی بنوائی۔ کھادی کے پرچار میں اس مرد عورت کا حصہ ایسا ویسا نہیں کہا جا سکتا۔ انہوں نے گجرات اور گجرات سے باہر ہاتھ کے سوت کے تیار کرنے کی ترکیب دوسروں کو سکھائی۔ یہ ان پڑھ لیکن مہذب بہن جب کرگھا چلانے بیٹھتی تو اس میں ایسی محو ہو جاتی کہ ادھر ادھر دیکھنے یا کسی سے بات چیت کرنے کی ضرورت بھی اپنے لیے محسوس نہیں کرتی تھی۔

☆☆☆

باب نمبر ۲۶

ایک مکالمہ

جس وقت سودیشی کے نام پر ترغیب دی گئی۔ اس وقت مل کے مالکوں کی طرف سے میرے خلاف خوب نکتہ چینی ہوئی۔ بھائی عمر سبحانی خود ہوشیار اور محتاط مل کے مالک تھے۔ اس لیے وہ اپنی واقفیت سے جانکاری کرتے تھے لیکن ساتھ ہی وہ دوسروں کے خیالات سے بھی روشناس کیا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک مل مالک کے دلال کا اثر بھائی عمر سبحانی پر بھی ہوا اور انہوں نے مجھے ان کے پاس لے جانے کا ذکر کیا۔ میں نے یہ بات منظور کر لی اور ہم ان مل مالکوں کے پاس گئے۔ وہ بولے۔

”یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ آپ کا سودیشی اندولن کوئی نئی تحریک نہیں ہے؟“

”جی ہاں۔“

”آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ تقسیم بنگال کے دنوں میں سودیشی تحریک نے خوب زور پکڑا تھا۔ اس تحریک سے ہماری ملوں کو خوب فائدہ ہوا تھا اور کپڑے کی قیمت بڑھا دی تھی اور جو کام کرنا نہیں چاہیے وہ بھی کیا تھا؟“

”میں نے یہ باتیں سنی ہوئی جن سے رنج ہوتا ہے۔“

”میں آپ کے رنج کو سمجھتا ہوں مگر اس کی کوئی وجہ خیال نہیں کرتا کیونکہ ہم دوسروں کی بھلائی کے لیے بیوپار نہیں کرتے۔ ہم نے تو نفع حاصل کرنا ہے۔ اپنے مل کے حصہ داروں کی جواب دہی کے ذمہ دار ہیں اور پھر قیمت تو کسی چیز کے نکاس پر انحصار رکھتی ہے۔ اس اصول کے خلاف کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا؟ اور بنگالیوں کو یہ بضرور سمجھ لینا چاہیے تھا

کہ ان کی تحریک سے سودیشی کپڑے کی قیمت ضرور بڑھے گی۔"

"وہ تو بیچارے میری مانند جلد یقین کر لینے والے ٹھہرے۔ اس لیے انہوں نے یہ مان لیا تھا کہ ملوں کے مالک اس طرح خود غرض نہیں بن جائیں گے اور فریب وغیرہ نہیں دیں گے۔ بلکہ سودیش کے نام پر بدیشی کپڑا فروخت کریں گے۔

"مجھے یہ معلوم تھا کہ آپ اس قسم کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اسی لیے میں نے آپ کو محتاط کرنے کی سوچی اور یہاں تک آنے کی تکلیف دی تا کہ سادہ لوح بنگالیوں کی طرح آپ بھی غلطی میں نہ رہ جائیں۔"

اتنا کہنے کے بعد سیٹھ نے اپنے ایک گماشتہ کو نمونے لانے کا اشارہ کیا۔ وہ نمونے ردی سوت کے بنے ہوئے کمبل کے تھے۔ انہیں لے کر وہ کہنے لگے۔

دیکھیے ہم نے یہ نیا مال تیار کیا ہے۔ اس کی بازار میں خوب کھپت ہے۔ ردی سے بنایا گیا ہے۔ اسی لیے سستا پڑتا ہے۔ اس مال کو ہم عین شمالی علاقہ میں پہنچاتے ہیں۔ چاروں طرف ہمارے ایجنٹ گھوم رہے ہیں۔ جس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہمیں آپ کی قسم کے ایجنٹوں کی ضرورت نہیں ہے اور یہ حقیقت ہے کہ جہاں آپ جیسے لوگوں کی شنوائی نہیں ہوتی وہاں ہمارے ایجنٹ اور ہمارا مال پہنچ جاتا ہے اور آپ کو یہ بھی جان لینا چاہیے کہ ہندوستان کو جس قدر مال کی ضرورت ہے اتنا تو ہم بنا بھی نہیں سکتے۔ اس لیے سودیشی کا سوال تو مال کی پیداوار کا ہے۔ اور جب ہم ضرورت کے مطابق کپڑا تیار کر لیں گے اور اس کی قسموں میں اصلاح کر سکیں گے تو باہر کا کپڑا خود بخود آنا بند ہو جائے گا۔ اس لیے میرا تو یہ خیال ہے کہ آپ جس ڈھنگ سے سودیشی تحریک چلا رہے ہیں اس سے نہ نہیں بلکہ نئی ملیں تیار کروانے پر اپنی توجہ مرکوز فرمایئے۔ اس جگہ سودیشی مال کھپانے کی تحریک کی ضرورت نہیں ہے۔ ضرورت تو سودیشی مال تیار کرنے کی ہے۔"

"اگر میں یہ کام کروں تو کیا آپ مجھے آشیرباد دیں گے؟" میں نے کہا۔

وہ بولا۔ "یہ کیسے؟ اگر آپ مل کھڑی کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو آپ شکریہ کے مستحق ہیں۔"

"میں یہ تو نہیں کرتا۔ ہاں چرخہ کے کام کو روح پرور بنانے کے کام میں لگا ہوا

ہوں۔"

"یہ کونسا کام ہے؟"

میں نے چرخے کی بات سنا دی اور کہا۔

"میں آپ کے خیالات سے متفق ہوتا جا رہا ہوں۔ مجھے ملوں کی ایجنسی لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے تو فائدہ کی بجائے نقصان ہوتا ہے۔ ملوں کا مال ایسے پڑا نہیں رہتا مجھے تو کپڑا تیار کرنے اور تیار شدہ کپڑے کو فروخت کرنے میں مصروف رہنا چاہیے۔ ابھی تو میں تیاری کے کام میں مصروف ہوں اور سودیشی میں یقینی رکھتا ہوں کیونکہ اس کے ذریعہ ہندوستان کے بھوکوں مرنے والی نصف بے کار عورتوں کو کام میں لگایا جا سکتا ہے اور وہ جو سوت تیار کریں انہیں بنوانا اور کھادی تیار کر کے لوگوں تک پہنچانی یہی میری تحریک ہے۔ چرخے کی تحریک کتنی کامیاب ہوگی۔ یہ تو میں کہہ نہیں سکتا۔ ابھی تو اس کا آغاز ہی ہوا ہے لیکن مجھے اس میں کامل یقین ہے۔ خواہ کچھ بھی ہو یہ تو فیصلہ شدہ امر ہے کہ اس تحریک سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ اس تحریک سے ہندوستان میں تیار ہونے والے کپڑے کی جتنی افراط ہوگی اتنا ہی فائدہ ہوگا۔ اس لیے اس کوشش میں آپ کا بتایا ہوا نقص نظر نہیں آتا۔"

وہ بولے۔ "اگر آپ اس طرح اس تحریک کو شروع کرتے ہیں۔ تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اور یہ ایک الگ بات ہے کہ اس مشینوں کے زمانہ میں چرخہ سے کام چلے گا یا نہیں۔ مگر اس کے باوجود میں آپ کی کامیابی کا خواہشمند ہوں۔"

☆☆☆

باب نمبر ۶۷

حرف آخر

اب ان ابواب کے بند کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ اس سے آگے میری زندگی اس حد تک عمومیت لیے ہوئے ہے کہ یہ ممکن نہیں کہ پبلک اس کے متعلق کچھ بھی نہ جانتی ہو۔ تحریکِ عدم تعاون کا آغاز اور ناگپور کانگرس میں خلافت کے سوال کو لے کر ستیہ آگرہ کے استعمال کی تجویز اور ہندو مسلم اتحاد کی کوشش۔ ان سب باتوں کا یہاں صرف اشارہ کیے دیتا ہوں بلکہ ۱۹۲۱ء سے تو میں کانگرس کے لیڈروں کے ساتھ اس قدر متقرب ہو گیا ہوں کہ کوئی بات ایسی نہیں رہی جن کے ذکر کے لیے میں ان کا نام تک نہ لے سکوں۔ ان باتوں کی یاد ابھی تازہ ہی ہے۔ شردھانند جی دیش بندھو لالہ لاجپت جی اور حکیم اجمل خان صاحب آج ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر اس کے باوجود ابھی کافی لیڈر خوش قسمتی سے موجود ہیں۔ کانگرس کے انقلاب کے بعد کی تاریخ تو ابھی تیار ہو رہی ہے اور میرے بڑے بڑے تجربے کانگرس کے ذریعہ ہی ہوئے۔ اس لیے ان تجربات کا ذکر کرتے وقت لیڈروں کا ذکر لازمی ہے۔ اس خیال سے مجھے ان باتوں کا ذکر ابھی نہیں کرنا چاہیے کہ یہ قبل الذکر ہیں اور جو تجربے ابھی عمل میں آ رہے ہیں۔ ان کی نسبت میرے خیال یقینی نہیں کہے جا سکتے۔ اس لیے ان ابواب کو فی الحال بند کر دینا ہی میں اپنا فرض خیال کرتا ہوں اور اگر کہوں کہ میرا قلم ہی آگے بڑھنے سے انکار کرتا ہے تو بھی باعث حجت نہیں ہوگا۔

قارئین سے الگ ہوتے ہوئے مجھے دکھ ہوتا ہے۔ میرے خیال میں میرے تجربات ابھی کافی قیمتی ہیں اور پتہ نہیں بلکہ ان کی حقیقت بیان کر سکوں گا یا نہیں، میں نے

اپنی طرف سے تو ٹھیک ٹھیک ذکر بیان کرنے سے کوتاہی نہیں کی اور سچائی کو جس روپ میں دیکھا ہے اور جس راستہ سے پایا ہے۔ اسی راستہ اور اسی انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی قارئین کے سامنے ان اذکار کو پیش کر کے اطمینان حاصل کیا ہے۔ کیونکہ مجھے ان سے یہ امید رہی ہے کہ ان سطور کے مطالعہ سے قارئین کے خیالات میں سچائی اور اہنسا کے متعلق عقیدت وافر تر ہو جائے گی۔

میں سچائی کو ہی پرمیشور مانتا ہوں۔ اگر قارئین کو ان ابواب اور صفحات میں اس بات کا احساس نہ ہو کہ حقیقت افروز بننے کے لیے اہنسا ہی ایک بڑی شاہراہ نہیں ہے تو میں اپنے آپ کو اس کوشش میں ناکام خیال کروں گا۔ کوشش بے شک کامیاب نہ ہو لیکن عقیدہ تو باطل نہیں ہو سکتا۔ میری اہنسا سچا ہوتے ہوئے بھی کچی ہے اور نامکمل ہے۔ اس لیے میری سچائی کی جھانکی اس سچائی کے آفتاب کی شعاع کی ایک کرن کی مانند قابلِ دید ہے جس کی ضیا کا ماپ ہزاروں معمولی آفتابوں کے مجتمع کرنے پر بھی نہیں مل سکتا۔ اس لیے میرے اس وقت تک کے تجربات کی بنیاد پر اتنا تو میں ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس سچائی کا پورن درشن اور سمپورن اہنسا کی کمی کی وجہ سے مجبور ہوں۔

ایسے محیط ستیہ نارائن کے کھلے درشن کے لیے ہر ایک ذی روح کے متعلق اپنی روح کی مانند محبت کی تحت ضرورت ہے۔ اس سچائی کے حاصل کرنے کا خیال کرنے والا آدمی زندگی کے کسی بھی پہلو میں ناکام نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ میری سچائی کی پوجا مجھے سیاسی میدان میں گھسیٹ کر لے گئی ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ سیاسیات کا دھرم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں انہیں بلا جھجک کہتا ہوں کہ وہ دھرم کو نہیں جانتے اور مجھے یقین ہے کہ یہ بات کہہ کر میں کسی طرح علم کی حد کو پاٹ نہیں رہا ہوں۔

دلی پاکیزگی کے بدوں ہر ایک ذی روح کے ساتھ وحدت کا احساس نہیں کیا جا سکتا اور دلی پاکیزگی کے نہ ہونے پر اہنسا دھرم کا پالن بھی نامناسب ہے کیونکہ ناپاک روحیں پرماتما کے درشن کے قابل نہیں ہیں۔ اس لیے زندگی کی منزل کے سارے میدان میں پاک طینتی کی ضرورت رہا کرتی ہے اور یہ پاکیزگی ممکن ہے کیونکہ انفرادی اور اجتماعی حالات میں اس قدر گہرا تعلق ہے کہ ایک آدمی کی پاکیزگی جماعت کو پاک بنا سکتی ہے اور ذاتی

کوشش کی طاقت تو ستیہ نارائن نے ہر ایک کو طبعی طور پر عنایت کی ہوئی ہے۔

لیکن میں تو ہر لحہ اس بات کو محسوس کرتا ہوں کہ شدھی اور پاکیزگی کی منزل دشوار ہے۔ شدھ ہونے کا مطلب تو من سے، زبان سے اور عمل سے ہے۔ یعنی نفرت اور محبت سے بالا ہونا ہے۔ اس حقیقت افروز کیفیت تک پہنچنے کے لیے ہر لحہ کوشش کے باوجود بھی میں وہاں تک پہنچ نہیں سکا۔ اس لیے عام لوگوں کی تعریف مجھے بھلا نہیں سکتی۔ بلکہ برعکس اس کے وہ عام طور پر میرے دکھ کی وجہ سے بن جاتی ہے۔ میں تو ذہنی خامیوں پر فتح پانا، ساری دنیا کو اسلحہ کے زور پر فتح کرنے سے بھی مشکل خیال کرتا ہوں۔ ہندوستان میں آنے کے بعد بھی میں نے اپنی پوشیدہ خامیوں کو دیکھا ہے اور دیکھ کر شرمندہ ہوا ہوں مگر ہمت نہیں ہاری اور سچائی کے تجربات سے میں نے راحت کا احساس پایا ہے اور آج بھی اسے محسوس کر رہا ہوں لیکن میں جانتا ہوں کہ ابھی مجھے بڑا دشوار راستہ طے کرنا ہے۔ جس کے لیے مجھے نیست ہونا پڑے گا۔ جب تک انسان خود بخود اپنے آپ کو حقیر نہیں سمجھ لیتا اس وقت تک مکتی اس سے دور رہتی ہے۔ اہنسا حلم کی حد ہے اور آخری مقام ہے اور یہ تجربہ شدہ بات ہے کہ اس قسم کے حلم کے بدوں مکتی بالکل مل ہی نہیں سکتی۔ اس لیے اس وقت تو ایسی اہنسک نرمی حاصل کرنے کی پرارتھنا کرتے ہوئے اور اس میں دنیا کی مدد کی استدعا کرتے ہوئے میں ان ابواب کو ختم کرتا ہوں۔

☆☆☆

ضمیمہ

حالات ۱۹۳۱ء تک

۱۹۲۵ء کے کانگریس کے اجلاس میں سہ گانہ بائیکاٹ کا پروگرام بنایا گیا۔ عدالتوں، سکولوں اور اسمبلیوں کے بائیکاٹ کی تحریک شروع ہوئی۔ مگر عوام کی نیم بیداری کی وجہ سے ایک سال میں سوراج حاصل کرنے میں کامیابی نہ ہوئی۔ ستمبر ۱۹۲۱ء کو مہاتما جی نے بار دولی ستیہ گرہ کی تحریک کی بنا ڈالی۔ مگر چورا چوری میں دیہاتیوں کے مشتعل ہجوم کے پولیس پر پل پڑنے کی وجہ سے یہ پروگرام بھی صورت حاصل نہ کر پایا۔ مگر مجموعی سول نافرمانی ترک نہ کی گئی۔ اس لیے حکومتِ ہند نے ۱۰/مارچ ۱۹۲۲ء کو پہلی بار مہاتما جی کو گرفتار کر کے چھ سال کے لیے قید و بند میں ڈال دیا اور ۵/فروری ۱۹۲۴ء کو اپنڈکس کے آپریشن کی وجہ سے آخر کار انہیں رہا کر دیا گیا۔ اس کے بعد متواتر چار سال تک نیم گوشہ نشینی کا دور رہا۔ تاہم کانگریس نے مہاتما جی کے تعمیری پروگرام کو اپنا لائحہ عمل بنائے رکھا۔ ۱۹۳۲ء کی گیا کانگریس، سوراج پارٹی کی ابتداء اور عروج کے ساتھ کانگریس کا اسمبلی میں شرکت کا زمانہ ایک اضمحلالی دور تھا۔ اسی دور کی پیداوار گول میز کانفرنس کا تخیل تھا۔ حکومتِ وقت نے دستوری کمیشن کے نام سے سر سائمن کی قیادت میں ایک وفد ہندوستان میں روانہ کیا۔ ہندوستان بھر میں کمیشن کی ترکیب اور طریقہ کار کی مشترکہ طور پر مذمت کی گئی۔ مرکزی اسمبلی میں لالہ لاجپت رائے

جی کی تجویز پر کمیشن کو سراسر ناقابلِ قبول قرار دیا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں ملک ہنگاموں کی آماجگاہ بن گیا۔ ۱۹۲۸ء میں مہاتما جی کو دوبارہ ملک کی قیادت کے لیے گوشۂ تنہائی سے باہر آنا پڑا۔ سائمن رپورٹ کے بعد گول میز کانفرنس کے انعقاد کا اعلان ہوگیا۔ مہاتما گاندھی، موتی لال نہرو اور دوسرے لیڈروں کی وائسرائے سے ملاقات کے نتیجہ کے طور پر یہ رائے غالب رہی کہ گول میز کانفرنس میں کانگریس کی نمائندگی سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ آزادیٔ کامل کے راستہ میں قدم بڑھانا چاہیے۔ لاہور کانگریس کے موقع پر راوی کے کنارے پہلی بار یکم جنوری ۱۹۳۰ء کو ہندوستان کی سیاسی، معاشی اور تمدنی ترقی کے لیے کامل آزادی کا عہد کیا گیا اور سال حال میں ہی ۱۲/ مارچ کو سول نافرمانی کی باضابطہ تحریک کا آغاز ہوا۔ مہاتما گاندھی نے احمد آباد سے اس تحریک کی ابتدا کی اور پیدل ہی سمندر کی طرف نمک کا قانون توڑنے کے لیے روانہ ہو پڑے۔ چند دنوں میں ہی ملک میں زبردست بیداری کی لہر موجزن ہو اٹھی اور ۵/ اپریل کو ڈانڈی کے مقام پر پہنچ گئے۔ حکومت حیرت زدہ ہو اٹھی۔ نتیجہ کے طور پر ۱۵/ مئی کو سلطنت کے قیدی کی حیثیت سے مہاتما جی کو بغیر مقدمہ چلائے گرفتار کرلیا گیا۔ ملک میں ہنگاموں اور بلووں کی لہر موجزن ہو اٹھی۔ جولائی ۱۹۳۱ء کو سرتیج بہادر سپرو اور مسٹر جیکر نے ہی مہاتما گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت جواہر لال نہرو سے جیل میں ملاقاتیں کیں۔

جھلکیاں

فرحت اللہ انصاری

۱۹۱۵ء کا زمانہ ہے گاندھی جی افریقہ سے واپس آرہے ہیں، بمبئی کی بندرگاہ پر اخبار نویسوں کا اچھا خاصا مجمع ہے۔ ایک پارسی نوجوان جھجک کر آگے بڑھتا ہے۔ اس خیال سے کہ سب سے پہلے وہی گاندھی جی سے بات کرے۔ حسبِ دستور اس نے انگریزی میں سوال کیا۔ گاندھی جی نے سوال کا جواب دینے سے پہلے اپنے نرم ونازک لہجے میں کہا:

''آپ بھی ہندوستانی، میں بھی ہندوستانی۔ میری مادری زبان بھی گجراتی، آپ کی مادری زبان بھی گجراتی۔ پھر آپ مجھ سے انگریزی میں سوال کیوں کرتے ہیں؟ کیا آپ کا خیال ہے کہ میں جنوبی افریقہ میں رہ کر اپنی مادری زبان بھول گیا ہوں؟''

☆☆☆

گاندھی جی شانتی نکیتن میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہ کل ہی آئے ہیں۔ آج پہلی صبح ہے۔

شانتی نکیتن کے لوگ جن میں اس زمانے میں کاکا کلیلکر بھی ہیں حسبِ معمول کام پر چلے جاتے ہیں۔ کام یہ ہے کہ شانتی نکیتن کی کیٹوں کے سامنے ایک تالاب ہے جسے وہ ہر صبح پاس کے ٹیلہ کو کھود کر پاٹتے ہیں۔ ایک گھنٹہ کی اس مشقت کے بعد جب پلٹتے ہیں تو ناشتہ تیار کرتے ہیں، کھاتے ہیں۔ پھر دوسرے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔

آج جو یہ ٹولی پلٹی تو کیا دیکھتی ہے کہ پھل پھلاری سب قاعدہ سے کٹی بنی تھالیوں میں لگی ہوئی ہیں۔

کاکا نے مہاتما گاندھی جی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا:

"آئیں! یہ سب آپ نے کیا ہے؟"

مہاتما جی نے جواب دیا "میں نے۔"

کاکا: "آپ نے! یہ تو کچھ اچھا نہیں لگتا کہ آپ یہ سب کریں اور ہم لوگ بیٹھ کر کھائیں۔"

مہاتما: "اس میں حرج ہی کیا ہے۔ تم کام پر گئے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا اتنی دیر میں میں تمہارا ناشتہ تیار کردوں۔"

☆☆☆

بمبئی ۱۹۱۵ء کی کانگریس ہو رہی ہے۔ گاندھی جی مارواڑی ودیالیہ میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ایک دن ان کو کہیں باہر جانا تھا۔ انہوں نے اپنے ڈیسک کی چیزوں کو سلیقہ سے سمیٹنا شروع کر دیا۔ سب چیزیں رکھ لینے کے بعد بھی وہ کسی چیز کو بڑے دھیان سے اِدھر اُدھر ڈھونڈنے لگے۔ کاکا کلیلکر نے پوچھا:

"باپو! آپ کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟"

باپو: "ایک پنسل ڈھونڈ رہا ہوں۔ ننھی سی ہے۔"

کاکا: "لیجیے آپ یہ پنسل رکھ لیجیے۔ میں اس پنسل کو ڈھونڈ کر رکھ لوں گا۔" مقصد یہ تھا کہ باپو کا قیمتی وقت کیوں ضائع ہو اور وہ بلاوجہ کیوں تھکیں۔"

باپو: "نہیں، مجھے وہی پنسل چاہیے۔ وہ مجھے ایک چھوٹے سے بچے نے دی تھی۔ میں اسے کھو نہیں سکتا۔"

کاکا بھی باپو کے ساتھ ڈھونڈنے میں لگ گئے اور جب تک اس ننھے بچے کا وہ ننھا سا تحفہ مل نہیں گیا، باپو کو چین نہیں آیا۔

☆☆☆

گاندھی جی نے گجرات میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ جب گجراتیوں کو معلوم ہوا کہ گاندھی جی لسانی صوبوں کی تشکیل پسند کرتے ہیں تو کچھ لوگوں کو "گجرات راجکیہ پریشد" (گجرات پولٹیکل کانفرنس) قائم کرنے کی سوجھی۔

گاندھی جی ٹھیک وقت پر کانفرنس پہنچ گئے۔

مہاراج تلک بھی مدعو تھے۔ وہ جیسا کہ اکثر ہوا کرتا تھا، آدھ گھنٹہ دیر سے پہنچے۔

گاندھی جی نے ان کا بڑے تپاک اور احترام سے خیر مقدم کیا مگر کہا:

"لوک مانیہ آدھ گھنٹہ دیر سے آئے ہیں۔ اگر ہمیں سوراج لینے میں آدھ گھنٹہ اور لگا تو اس کا عذاب لوک مانیہ کے سر رہے گا۔"

☆☆☆

۱۹۳۰ء کا زمانہ ہے۔ گاندھی جی یرودا جیل میں ہیں۔ میجر مارٹن جیل سپرنٹنڈنٹ گاندھی جی کے لیے فرنیچر اور برتن وغیرہ کا انتظام کر رہے ہیں۔ جب یہ چیزیں گاندھی جی کے پاس پہنچنا شروع ہوتی ہیں تو گاندھی جی جیل سپرنٹنڈنٹ سے کہتے ہیں:

"یہ سب کس کے لیے آ رہا ہے؟"

جیل سپرنٹنڈنٹ نے جواب دیا: "آپ کے لیے۔ میں نے گورنمنٹ کو لکھا ہے کہ اتنے بڑے معزز مہمان کے خورد و نوش کے لیے تین سو روپے مہینے کا انتظام ہونا چاہیے۔ اور مجھے امید ہے کہ گورنمنٹ اسے بھی منظور کر لے گی۔"

گاندھی جی نے کہا: "آپ کا بہت بہت شکریہ۔ مگر میرا ماہانہ خرچ ۳۵ روپے سے زیادہ نہ ہوگا۔ مجھے اس سب سامان کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ میری صحت ٹھیک ہوتی تو میں کھانا بھی "سی" کلاس کا کھاتا۔ اس لیے مہربانی کر کے یہ سب لوازمات ختم کیجیے۔"

ساری کراکری واپس ہوگئی اور اس کی جگہ وہی تسلا اور چمچو گاندھی جی کے لیے بھی آ گیا۔

☆☆☆

شام کی پرارتھنا ختم ہو چکی ہے۔ باپو تکیہ سے ٹیک لگائے اپنی چارپائی پر بیٹھے شری روجی بھائی پٹیل سے باتیں کر رہے ہیں اتنے میں "با" اٹھیں اور ایک چادر کو دوہرا تہرا کر کے انہوں نے باپو کے شانوں پر ڈال دیا۔ باپو اسی انہماک سے باتیں کرتے رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد روجی بھائی کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بڑا سا کالا سانپ باپو کی پیٹھ سے رینگتے رینگتے ان کے داہنے شانے کی نوک پر آ گیا ہے اور ادھر ادھر دیکھ رہا ہے کہ اب کدھر جائے۔ روجی کی نظر اس پر گڑ کر رہ گئی۔ دوسرا ہوتا تو چیخ اٹھتا اور نہ جانے کیا ہو جاتا۔

مگر روجی بھائی ان غیر معمولی آدمیوں میں سے تھے جن کے حواس کبھی نہیں

جاتے۔ پھر بھی ان کے سلسلۂ کلام میں اتنا فرق آ ہی گیا کہ باپو نے پوچھا:

"کیا بات ہے۔ تمہارا دھیان کہاں ہے؟"

روجی بھائی نے نہایت آہستہ سے کہا:

"کچھ نہیں باپو۔ بس ایسے ہی بیٹھے رہیے۔ آپ کے شانے پر سانپ چڑھ آیا ہے۔"

باپو: "میں بیٹھا رہوں گا مگر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

روجی: "میں چاہتا ہوں کہ چادر مع سانپ کے آپ کے اوپر سے اٹھا کر پھینک دوں۔"

اتنی ہی گفتگو سے بھی سانپ کو کچھ بھنک لگ ہی گئی۔ اس نے منہ پھیرا اور کسی تہہ میں چپکے سے غائب ہو گیا۔

روجی اٹھے تو باپو نے چپکے سے کہا:

"میں تو بے حس و حرکت بیٹھا ہوں مگر تم اپنے کو بچائے رہو۔"

روجی نے احتیاط سے کونے پکڑ کر چادر اتار لی اور جیسے ہی سانپ نے منہ نکالا انہوں نے اسے جھٹک کر دور پھینک دیا۔

سانپ کے بارے میں تو مشہور ہے کہ اگر وہ کسی کے سر پر پھن کاڑھ دے تو وہ شخص بادشاہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ دوسرے روز جب اخبار نویسوں نے اپنی جولانی طبع دکھائی تو ایسی ہی قیاس آرائیاں شروع ہو گئیں۔

خود کا کلیکلر سے ایک صاحب نے پوری سنجیدگی سے کہا:

"اگر وہ باپو کے شانے سے سر پر چڑھ جاتا تو باپو ضرور ہندوستان کے بادشاہ ہو جاتے۔"

باپو سے پوچھا گیا کہ آپ کو کیا محسوس ہوا، جب آپ کو پتہ چلا کہ سانپ آپ کے شانے پر چڑھ آیا ہے۔ تو انہوں نے کہا:

"گھڑی بھر کو تو میں ڈرا۔ اس کے بعد خیال بھی نہیں ہوا۔"

☆☆☆

گاندھی جی برما کے چند روزہ دورہ سے واپس ہی ہوئے تھے کہ تار آیا (فروری

1915ء) اور معلوم ہوا کہ گوکھلے جی اب نہیں رہے۔

گاندھی جی نے فوراً ہی یہ عہد کیا کہ وہ آج سے سال بھر تک ننگے پیر رہیں گے اور پونا روانہ ہو گئے جہاں گوکھلے جی کا انتقال ہوا تھا۔

گوکھلے جی کی خواہش تھی کہ گاندھی جی ان کی سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی میں شامل ہو جائیں، مگر گاندھی جی کو اس سوسائٹی سے پورا اتفاق نہیں تھا، اس لیے وہ ان کی زندگی میں کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔

جب گوکھلے جی مر گئے تو ان کی وہ خواہش گاندھی جی کے لیے ایک وصیت سی ہو گئی۔ اس لیے انہوں نے سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کی ممبری کے لیے درخواست دے دی۔

سوسائٹی بڑے چکر میں پڑ گئی۔ گاندھی جی کو ممبر بناتی ہے تو مشکل، کہ وہ اپنے راستے سے ہٹیں گے نہیں، اور ممبر نہیں بناتی تو بھی مشکل، کہ گاندھی جی کی درخواست اور رد کر دی جائے۔

جب گاندھی جی کو سوسائٹی کی اس الجھن کا پتہ لگا تو انہوں نے اپنی درخواست واپس لے لی مگر سوسائٹی کی سرپرستی کرتے رہے۔

☆☆☆

شنکر لال جی کا کہنا ہے کہ جب ہم کالج میں پڑھتے تھے تو ہمارا خیال تھا کہ میں، جیوت رام کرپلانی اور عمر سبحانی نے ہوم رول کا بڑا کام کیا ہے اور بمبئی کی ساری سیاست پر چھائے ہوئے ہیں۔

ایک دن ہم نے سنا کہ ایک آدمی گاندھی ہندوستان آیا ہے جو بہت کچھ کرنے والا ہے۔ خیال ہوا کہ چلو اس سے ملیں اور دیکھیں کہ اس سے کہاں تک کام لیا جا سکتا ہے۔ ہم لوگ گئے۔ گاندھی جی زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے کرسیاں گھسیٹیں، بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ نہ پوچھئے کیسے سرپرستانہ لہجے میں گفتگو کی ہے۔

مگر جب پلٹے تو محسوس ہوا کہ ہم اس سے بہت متاثر واپس آئے ہیں۔

☆☆☆

ایشین ریلیشنز کانفرنس میں دوسرے وفود کے ساتھ مہاتما گاندھی

مہاتما گاندھی' جواہر لال نہرو ایک اے۔آئی۔سی۔سی میٹنگ بمبئی کے دوران
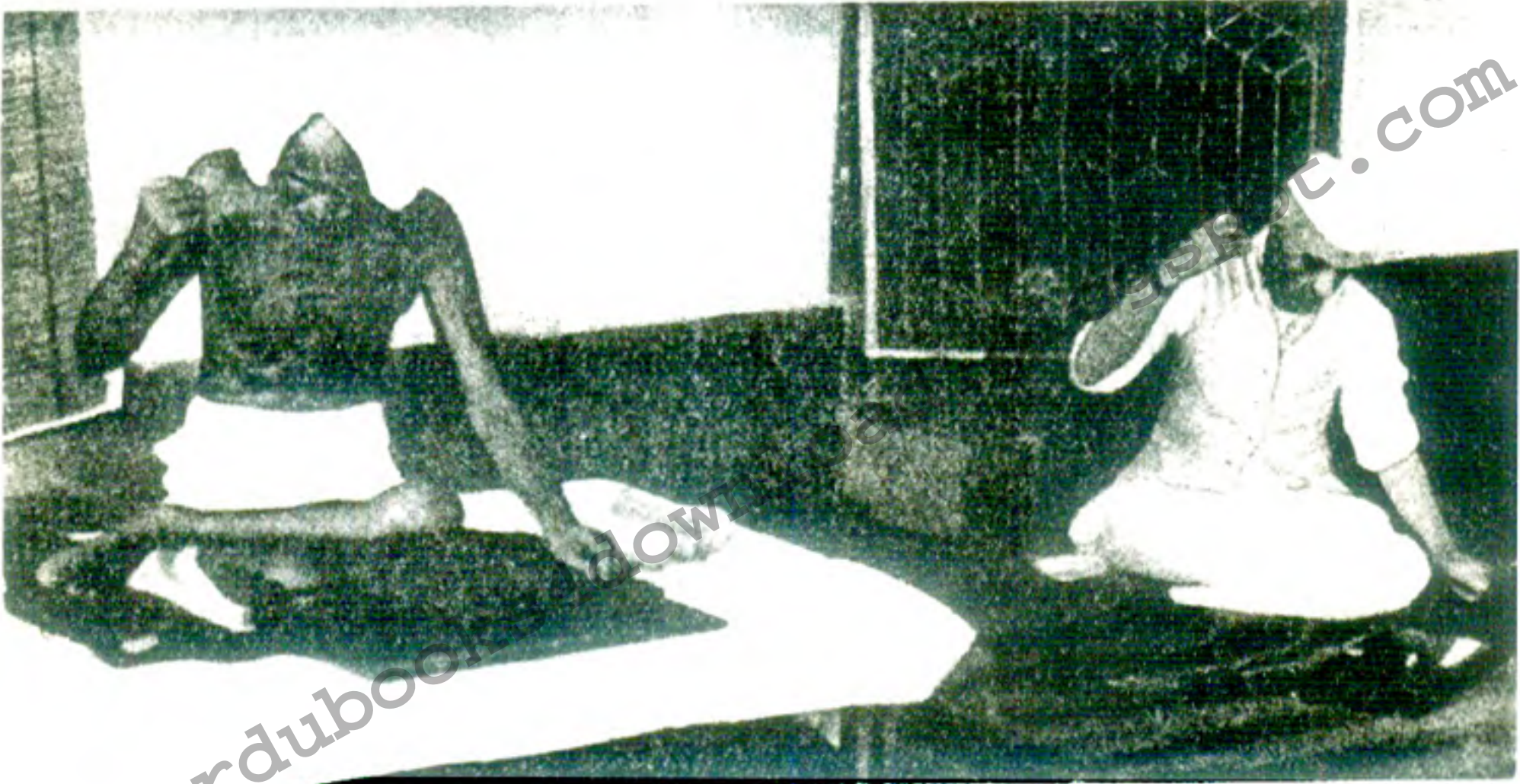
مہاتما گاندھی جواہر لال نہرو کے ساتھ چرخہ کاتتے ہوئے